قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
اشاعت کا اناسی واں سال
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

اپریل 2022ء
لاہور

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ (2:185)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے' کہ اِس اجتماعی اور عسکری ٹریننگ (اور تربیتِ نفس) کے لئے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی — وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور اُبھری ہوئی ہے، اور جو مستقل اَقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ روزوں کا نظم وضبط' اِس عظیم پروگرام کے لئے مستعد رہنے کی سالانہ ٹریننگ ہے۔ سو جو شخص' اس مہینے میں' اپنے گھر پر موجود ہو' تو اُسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو مریض ہو، یا حالتِ سفر میں' تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ (اور جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتا ہو اس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ) خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے' سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تم دوسرے دِنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو۔ (مفہوم القرآن از پرویز)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (3:19)-

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

اپریل 2022ء
جلد 75 شمارہ نمبر 4

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: رویتِ ہلال	ادارہ	4
ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	پرویزؒ	7
حضرت عمرؓ (قرآن کے سانچے میں ڈھلا ہوا انسان)	آغا شورش کاشمیری مرحوم	14
درسِ قرآن (2:183-184)	علامہ پرویز علیہ الرحمۃ	18
تشکیلِ معاشرہ اور قرآنی کردار	ڈاکٹر علی نصیر عباسی	32
اعجاز القرآن	خواجہ ازہر عباس، کراچی	44
حسنِ ظن	محمد سلیم اختر	55

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No.5	58

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

رویتِ ہلال

علماء اور حکومتِ وقت کے لئے ایک تجویز

جن مہینوں کے پہلی تاریخ کے چاند کو ہمارے معاشرے میں خاص اہمیت حاصل ہے ان میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جس کی رویتِ ہلال میں ہر سال اختلاف نہ ہوتا ہو۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی اپیل کیجئے تو فوراً ایک ''حدیث'' پڑھ کر سنا دی جاتی ہے کہ ''اختلاف امتی رحمۃ'' (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) صحاح، سنن، مسانید، موطات، مصنفات، معاجم غرض دنیا کی کسی کتابِ حدیث میں یہ حدیث موجود نہیں لیکن اسے خوب اچھالا گیا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اختلافات باقی رہیں اور پارٹی لیڈرشپ پر زد نہ آئے۔ اگر گروہی جھگڑے بالکل ختم ہو جائیں تو بہت سے لوگوں کی سیادت و قیادت بلکہ ان کا وہ مصرف ہی ختم ہو جاتا ہے جس سے ان کا مفادِ عاجل وابستہ ہے یہ جھوٹی اور جعلی روایت (اختلاف امتی رحمۃ) کچھ اس انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ گویا اتحادِ امت رحمت نہیں ہے۔ صرف اختلافِ امت ہی سراپا رحمت ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ رمضان اور عیدالفطر میں بھی یہ حضرات رویتِ ہلال کی صحیح تاریخ نہیں معین کر پاتے۔

> ''اختلاف امتی رحمۃ'' (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) صحاح، سنن، مسانید، موطات، مصنفات، معاجم غرض دنیا کی کسی کتابِ حدیث میں یہ حدیث موجود نہیں لیکن اسے خوب اچھالا گیا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اختلافات باقی رہیں اور پارٹی لیڈرشپ پر زد نہ آئے

اب وقت آ گیا ہے کہ ہر روز کی اس بیکار کی الجھن کو بالکل ختم کر دیا جائے اور اس کی صرف ایک شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ فلکی حساب پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا جائے کہ فلاں دن سے فلاں مہینہ شروع ہوگا ہمارے علمائے کرام کو فلکیات کے علم پر غالباً کوئی اعتماد نہیں کیونکہ حدیث شریف میں صرف اتنا آیا ہے کہ صوموا الرویۃ وافطر والرویۃ۔ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو۔

ایک امی اور سادہ ترین تمدن رکھنے والی امت کو اس سے زیادہ اور کیا بتایا جا سکتا تھا؟ جو امت لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتی ہو اس کے لئے بجز ''رُویت'' کے اور کیا طریقہ تجویز فرما سکتے تھے۔ وہاں فلکی تقویم کے وہ انکشافات موجود نہ تھے۔ نیز اس

وقت رویت کا بدل صرف ایسی عینی شہادتیں ہوسکتی تھیں جو قرب و جوار سے حاصل ہوجائیں اور اس قرب و جوار کی مسافت اتنی مختصر و محدود ہو کہ ایک انسان ۔۔۔ پیدل یا سوار ۔۔۔ آسانی سے چند گھنٹوں میں خبر لے کر آ جائے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ رسل و رسائل کا یہ حال ہے کہ ہزاروں میل سے چوتھائی سیکنڈ میں خبریں آ جاتی ہیں۔ مسافت اتنی سکڑ گئی ہے کہ مہینوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے۔ فلکی علوم اور تقویمات کا یہ عالم ہے کہ اب وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ:

(1) 29 دن، 12 گھنٹے، 44 منٹ اور 17 اعشاریہ 78 سیکنڈ میں چاند اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔

(2) 365 دن 6 گھنٹے 9 منٹ اور 9۔ اعشاریہ 5 سیکنڈ میں زمین اپنی مداری گردش پوری کر لیتی ہے۔ اور آج پورے وثوق کے ساتھ مہینوں پہلے یہ پیشگوئی کر دی جاتی ہے کہ

(3) اتنے بج کر اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر فلاں جگہ چاند گرہن یا سورج گرہن لگنا شروع ہوگا۔ اور چاند یا سورج کے اتنے حصے پر گہن لگے گا اور پھر کم ہونا شروع ہوگا۔ اور اتنی دیر تک فلاں جگہ اور اتنی مدت تک فلاں جگہ گہن قائم رہے گا۔

اس موقع پر ہماری طرف سے کچھ سننے کے بجائے صبحی محمصانی کی زبان سے سنئے وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ المعلول یدور مع علته وجودا وعدما (معلول اپنی علت کے ساتھ موجود و معدوم ہوتا ہے) لکھتے ہیں کہ:

(عربی سے ترجمہ) ''اور اسی قاعدے کی بنیاد پر بعض فقہاء نے فلکی حساب سے اسلامی مہینوں خصوصاً رمضان کے ہلال کی تعیین کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے کہ وہ حدیث جس میں روزے کے متعلق صرف رویت ہلال پر اعتماد کرنے کا حکم ہے ایک منصوص علت کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ (مخاطب) امت امی واقع ہوئی تھی جو لکھنا اور حساب کتاب کرنا نہیں جانتی تھی۔ لہٰذا جب یہ امت اُمیّت سے نکل کر لکھنے پڑھنے اور حساب و کتاب کے لائق ہوگئی اور لوگوں کے لئے ہلال کے حساب میں یقین اور قطعیت تک پہنچنے کا امکان و سامان پیدا ہوگیا تو اس عمومی صورت حال کے ہوتے ہوئے اور اُمیّت کی علت ختم ہونے کے بعد اب یہی ضروری ہے کہ لوگ اس (حسابی) قطعیت و یقین کی طرف رجوع کریں۔ اور ہلال کو معلوم کرنے کے لئے تنہا (فلکی) حساب و کتاب کا طریقہ اختیار کریں اور رویت کے (سابق طریقے) کی طرف وہیں رجوع کریں جہاں فلکیات کا جاننا دشوار ہو۔''

> ہلال دیکھ کر صوم و افطار کا حکم اس امت کے لئے ہے جو اُمی ہو۔ اور فلکیات سے واقف نہ ہو۔ نہ خبریں پہنچائی جاسکتی ہوں، نہ اخبار وغیرہ پہنچتے ہوں

محمصانی نے یہ پوری عبارت اپنی مشہورِ عالم کتاب ''فلسفۃ التشریع'' میں احمد شاکر کی کتاب ''اوائل الشھور العربیۃ'' سے نقل کی ہے جو اسی مضمون پر لکھی گئی ہے کہ اب ہلال کے معاملہ میں فلکی حساب پر بلا تامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس عبارت سے جو نکات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:

(1) معلول ہمیشہ اپنی علت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

(2) ہلال دیکھ کر صوم وافطار کا حکم اس امت کے لئے ہے جو اُمی ہو۔ اور فلکیات سے واقف نہ ہو۔ نہ خبریں پہنچائی جا سکتی ہوں، نہ اخبار وغیرہ پہنچتے ہوں۔

(3) لیکن جہاں یہ مجبوریاں نہ ہوں وہاں بلا تامل فلکی علم کے مطابق تعیین ہلال کی جا سکتی ہے اور اسی کے مطابق اسلامی تقریبات ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ آج پوری امت کس طرح اپنے بعض خالص دینی معاملات میں حساب و کتاب ہی پر اعتماد کر رہی ہے اور یہ اعتماد بالکل قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً

(1) آج کوئی بھی سحری کے وقت اٹھ کر سیاہ اور سفید دھاری کے امتیاز کو نہیں دیکھتا۔ فلکی حساب ہی کے مطابق سائرن بجتا ہے یا گولا چھوٹتا ہے اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔

(2) بلکہ افطار کے وقت بھی غروب آفتاب کی رویت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی اور فلکی ریاضیات ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

(3) اب ایک نمازی بھی سایہ ناپ کر یا اپنی آنکھوں سے شفق وغیرہ کو دیکھ کر نمازیں نہیں پڑھتا بلکہ فلکی حساب کے مطابق جو اوقات نامے مسجدوں میں آویزاں ہوتے ہیں ان ہی پر اعتماد کر کے ساری نمازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔

غرض کئی جگہ دینی معاملے میں فلکیات پر اعتماد کیا جاتا ہے تو ہلالِ رمضان وعید میں بھی فلکیات پر اعتماد کر لیا جائے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ قرآن کی رُو سے تو قمری اور شمسی دونوں طریقوں سے کیلنڈر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ملت کے اجتماعی مصالح کا تقاضا یہ ہو کہ شمسی مہینوں کے مطابق حساب رکھنا زیادہ منفعت بخش ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر کبھی اسلامی نظام قائم ہوا اور اس نے ایسا فیصلہ کر لیا تو پھر رویتِ ہلال کی اہمیت ہی نہیں رہے گی۔ نوع انسانی سمٹ کر ایک برادری بنتی جا رہی ہے۔ جب یہ برادری ایک خدا کے ایک قانون (قرآن) کے تابع آ جائے گی تو پھر حساب کتاب بھی اسی طرح رکھا جائے گا جس سے ان کی وحدت مستحکم ہوتی چلی جائے۔

آج کوئی بھی سحری کے وقت اٹھ کر سیاہ اور سفید دھاری کے امتیاز کو نہیں دیکھتا۔ فلکی حساب ہی کے مطابق سائرن بجتا ہے یا گولا چھوٹتا ہے اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں

❁❁❁❁❁

پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلیمؒ کے نام

ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟

سلیم! میرے مضامین پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآن کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس کتاب مبین میں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور فوز و فلاح کے لئے غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوع انساں کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا واحد حل اور زندگی کے مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں اور میرا یہ عقیدہ محض خوش فہمی پر مبنی نہیں بلکہ میں علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں، ایسا یقین جو وجہء طمانیت قلب اور باعث تسکین روح ہوا کرتا ہے، نہ کہ توہم پرستی کا پیدا کردہ فریب نفس جسے یقین اور اطمینان کا نام دے دیا جاتا ہے۔

> تم بالکل حق بجانب ہو، کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے، روزے بھی رکھتی ہے، زکوٰۃ بھی دیتی ہے، حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے، تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہ، (حضور نبیٔ اکرم ﷺ اور صحابہؓ کے عہد) میں ہوتا تھا

تم پوچھتے ہو، اور ایسا پوچھنے میں تم بالکل حق بجانب ہو، کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے، روزے بھی رکھتی ہے، زکوٰۃ بھی دیتی ہے، حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے، تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہد محمد ﷺ رسول اللہ والذین معہ، (حضور نبیٔ اکرم ﷺ اور صحابہؓ کے عہد) میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں، اور نہ ہی یہ طریق ان حقائق کو سمجھنے کے لئے چنداں مفید ہوتا ہے، اس لئے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ ''اعمالِ حسنہ'' کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب، جبکہ آفتاب کی شعاعوں میں تمازت باقی نہیں رہی، رحمتے کی بیوی اپنے خوردسال بچوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھی ہے۔ رحمتے کی بیوی کو تم جانتے ہو؟

تم بچپن میں ان کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی وشادابی ہوتی۔ لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسی افسردگی اور پژمردگی میں بدل دیا تھا کہ وہ ایک اجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نورِ عصمت کے (جو ہر ایسی پاک دامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہئے) رونق اور زندگی' تازگی اور بشاشت کا کوئی نشان تک باقی نہ تھا۔ ہاں! وہ اپنے بچوں کو لے کر چولہے کے قریب آ بیٹھی۔ خشک ٹہنیاں' سوکھے ہوئے پتے' خس وخاشاک' دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔ انہیں سلگا دیا تاکہ بچے آگ تاپتے رہیں۔ لیکن بچوں کو تو سردی سے زیادہ بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے ان کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا اور یوں' ان ننھے بچوں کو نہیں! خود اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سورج ڈوب گیا تو گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں' پنڈلیاں گرد وغبار سے اٹی ہوئی' گھٹنوں تک پرانا تہمد' پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ بس' اس شدت کے جاڑے میں یہی کل کائنات' چہرے پر زردی چھائی ہوئی' ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں' گھر کی طرف قدم اٹھاتا' لیکن قدم بمشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو بیوی نے خاموشی سے بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدوری نہیں ملی۔ دن بھر ادھر ادھر پھرتا' لوگوں کی منتیں خوشامدیں کرتا رہا لیکن کوئی کام نہ مل سکا۔

عین اس وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت وعظمت پر ایک دوسرے کو مبارکباد اور خواجہ صاحب کو جنت کی بشارتیں دے رہے تھے۔

❁❁❁

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہو نا! وہ تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کس قدر ذہین اور کیسا شریف بچہ تھا؟ لیکن بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے؟ میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچہ کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ لیکن دل کو کڑا کر کے بیٹے کو تسلی دی کہ مدرسے سے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں ابھی پکاتی ہوں۔ جاؤ میرا بیٹا! خدا حافظ!

سلیم! اگر ہمت ہو تو اس ماں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قیامت کے جذبات غم وحزن کا طوفان برپا ہوگا۔ وہ غربت وفلاکت کا مجسمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ باہر چلی گئی ہوگی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے؟ عنایت اللہ نے اندر آ کر سب سے پہلے روٹی والے

رومال کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموش باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ متنوع پھل، قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چنی رکھی تھیں کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دووقت کا بھوکا یتیم انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

❁❁❁

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدت ہوئی چالی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا تھا، وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلہ میں ایک حکیم جی تھے۔ وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ بھولی وہاں سے نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اٹھنی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے قرض مل جائیں۔ لیکن کسی نے کچھ نہ دیا۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن حاجیوں کی اسپیشل ٹرین روانہ ہوئی تھی اور سینکڑوں روپوں کے پھول اسٹیشن پر بکھرے پڑے تھے۔

> اسلام ایک نظام زندگی ہے۔ دنیا کے مذاہب جن میں انسانی تصرفات ہو چکے ہیں، مذہب کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسا معاشرہ (سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوع انسان کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ لے

❁❁❁

اور تم نے رضیہ بچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ اسے جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے کپڑے نہیں کہ تن ڈھانپ کر گھر کی چاردیواری سے باہر نکل سکے۔ جب اس نے کپڑے بھی مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِ راہ کیا ہوگا۔ اس نے گاؤں کے چوکیدار کو کہلا بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جائے لیکن جب اسے معلوم تھا کہ رضیہ کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اجرت کیسے ساتھ چلا جاتا؟ گاؤں میں دور نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسے فرصت تھی کہ اس کی مصیبت میں اس کے ساتھ ہو لے؟ سارا گاؤں فتو خاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا۔ غریب اکیلی، چلچلاتی دھوپ میں پیدل روانہ ہو گئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے۔ (یہ وہی رضیہ تھی جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں جو (''شمس العلماء'' تھے، دو حج کئے تھے)۔ اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان مذہبی معاملات میں اپنے کٹرپن میں مشہور ہیں۔ لیکن وہ ''مذہبی معاملات'' کیا ہیں؟ ذرا سن لو۔ مقلد اور غیر مقلد کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آتے تھے۔ اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا۔ خود

مقلدوں کے ہاں بھی دو پارٹیاں بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک ''عظیم الشان'' مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ یہ مولوی صاحب بقول ایک گروہ کے بہت ''بھاری'' مولوی تھے۔ تین تین کوس تک ان کی آواز جاتی تھی۔ انہوں نے مسئلہ بیان کیا کہ مسجد کی شان رسولؐ اللہ کی شان سے بڑی ہے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ خود مسجد میں چل کر آتے تھے اور مسجد کبھی ان کے پاس چل کر نہیں جاتی تھی۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ رسولؐ اللہ کی شان کو مسجد کی شان سے بڑا سمجھتے تھے۔ پھر کیا تھا' دو پارٹیاں بن گئیں۔ باہمی جھگڑے ہوئے' لڑائیاں ہوئیں' مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ قریب سال بھر ہو گیا یہ آگ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے اور ہر فریق اس مساعی حسنہ کو ''جہادِ عظیم'' قرار دے رہا ہے۔ اسی باہمی تشتت و انتشار کا نتیجہ ہے کہ کھیت ویران ہو رہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ زمین کا بیشتر حصہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ بقایا رہن رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد تم دیکھو گے کہ سکھ تمام گاؤں کے مالک بن جائیں گے اور یہ ''دین دار'' مسلمان ان کے مزارعہ ہو جائیں گے۔ اس پر مولوی صاحب انہیں مبارک باد دیں گے کہ انہوں نے یہاں کی زمین بیچ کر بہشت میں مکان خرید لیا۔ اس لئے یہ سودا خسارے کا نہیں۔

> جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت' تمکن و استخلاف نہیں (یا وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ نہیں لئے جا رہے) وہ ایمان' ایمان اور وہ عمل' عمل صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے' کیونکہ اللہ کے وعدے تو بہر حال سچے ہیں اور اس کا قانون اٹل

تم کہو گے کہ یہ تو جہلا کی باتیں ہیں۔ لیکن تمہیں وہ خطبہء جمعہ بھی تو یاد ہو گا جو شہر کی جامع مسجد میں شعبان المعظم کے مبارک مہینے کی تقریب پر تم نے خود سنا تھا۔ جناب خطیب نے' جو خدا کے فضل سے دیوبند کے فارغ التحصیل مولوی صاحب ہیں اور جن کے پاس اپنے بیان کی تائید میں سینکڑوں حوالے بھی موجود تھے' یہی فرمایا تھا نا کہ ''شب برات'' ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ پکار پکار کہتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے جو جی میں آئے مانگیں۔ میں ہر ایک کی طلب کو پورا کروں گا۔ لہٰذا جس شخص نے اس رات میں پچاس نفل پڑھ کر مغفرت کی دعا مانگ لی اس کی نجات کا اللہ تعالیٰ خود ذمہ ہے''۔ اس کے بعد تمہیں یاد ہو گا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے فرمایا تھا کہ رحمت خداوندی کے اس بحر ذخار میں ہر ایک کا حصہ برابر ہو گا۔ لیکن ایک سوختہ بخت اس سے محروم رہ جائے گا۔ لوگوں کی آنکھیں اوپر کو اٹھیں کہ معلوم کریں کہ وہ کون بدنصیب ہو گا جو ابرِ رحمت کی ایسی گہر باری سے فیض یاب نہ ہو سکے گا؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایک' اور صرف ایک شخص اس رحمت سے محروم رہ جائے گا۔ یعنی وہ جس کا پاجامہ اس کے ٹخنوں سے نیچے ہو گا۔ یہ تو سلیم! ''جہلا'' کی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی مولوی صاحب یہ کچھ اپنی طرف سے بیان کر رہے تھے۔ انہیں یہ سب کچھ ''عین اسلام'' کہہ کر پڑھایا گیا تھا

اور وہ اسی کو ''عین اسلام'' سمجھ کر آگے پہنچا رہے تھے! ہاں! تو میں تمہیں رضیہ بی بی کی بپتا کی داستان سنا رہا تھا اور ایک رضیہ ہی پر کیا موقوف ہے۔ ذرا اپنے گردوپیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے واقعات ہر روز تمہارے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ سو عزیزم! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال اٹھانا کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے، ان کی زکوٰۃ اور ان کے حج یعنی ان کے ''اعمال حسنہ'' وہ نتائج کیوں نہیں پیدا کرتی جو ہونے چاہئیں تھے' کچھ تعجب انگیز نہیں۔ سلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے۔ دنیا کے مذاہب جن میں انسانی تصرفات ہو چکے ہیں' مذہب کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسا معاشرہ (سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوع انسان کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ لے۔ اس مقصد عظیم کے لئے اسلام ہر عبد مومن کو اس کارگہء حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ ہو' مشینری بیکار ہو جائے گی۔ آج ہماری مشینری بیکار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عملی رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلت و مسکنت اور افلاس و نکبت کا چھا جانا اور پھر اس قوم کا اس حالت پر مطمئن ہو جانا' خدا کا غضب ہے' اللہ کا عذاب ہے۔

> میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمال اسلامی کا ماحصل محض اسی دنیا کی فلاح و کامیابی' غلبہ و تسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سطوت اور شوکت و عظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں سرخروئی اور آبرومندی کی زندگی بھی

اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت' تمکن و استخلاف نہیں (یا وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ نہیں لئے جا رہے) وہ ایمان' ایمان اور وہ عمل' عمل صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے' کیونکہ اللہ کے وعدے تو بہرحال سچے ہیں اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کے معراج کبریٰ' یعنی دور رسالت ؐ کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کون سا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ہی تو تھا جس نے چند سال کے عرصے میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی' اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا' بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور کھجوروں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم' قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ ان ہی

سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مرد مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزاء تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان (یعنی مقصود آخر) قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) وجہ ستائش اللہ کا وہ پروگرام (نظام) ہے جو دنیا میں خدا کی ربوبیت عامہ (نوع انسان کی پرورش وتربیت) کا مظہر ہے۔ لہٰذا جو اعمال اس نظام کے قیام کا ذریعہ نہیں بنتے وہ بے روح رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

❁❁❁

سلیم! ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمال اسلامی کا ماحصل محض اسی دنیا کی فلاح وکامیابی غلبہ و تسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت وسطوت اور شوکت وعظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں سرخروئی اور آبرومندی کی زندگی بھی۔ اگر ہمارے اعمال اس دنیا میں شوکت وعظمت پیدا نہیں کرتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اعمال اسلام کی میزان میں پورے نہیں اترتے۔

❁❁❁

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہوگئی۔ حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تم متفق ہو گے کہ قرآن کا مقصد لوگوں کو تمام خودساختہ سلاسل واغلال سے آزاد کر کے ان سے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرانا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا اپنی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد امت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں ہوا اور ہر وہ طوق جسے اتار پھینکنے کے لئے قرآن آیا تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا؟ امم گذشتہ جن جرائم کی پاداش میں ذلت ومسکنت کے عذاب میں گرفتار ہوئی تھیں، کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ وہ ایک بچے کے ساتھ ایک قسم کا اور دوسرے کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرے گی۔ اس کے قانون اٹل ہیں اور ان کا ہر ایک پر یکساں طور سے اطلاق ہوتا ہے۔ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب

> فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ وہ ایک بچے کے ساتھ ایک قسم کا اور دوسرے کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرے گی۔ اس کے قانون اٹل ہیں اور ان کا ہر ایک پر یکساں طور سے اطلاق ہوتا ہے۔ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو ان پر عذاب کیوں نہ آتا؟

مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو ان پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی زیادہ سختی سے عذاب آنا چاہئے تھا کہ ان کے پاس قانون خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لئے موجود تھا' لیکن انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہئے؟ انہیں وراثت کتاب کے لئے منتخب کیا گیا۔ نوع انسان کے لئے بہترین امت قرار دیا گیا۔ لیکن سب ایمان وعمل کے بدلے میں' نہ صرف نام رکھوانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا عذاب کیوں مسلط ہوا؟ سلیم! اخوت' مساوات' حریت' وحدت انسانی' جماعتی زندگی' مرکزیت' اطاعت' فرد کا ملت کے لئے سب کچھ کرنا اور ملت کا افراد کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ تھیں نظام حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاء الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دور ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو اور اس کے بعد قرآن کریم کی کسوٹی سے پرکھتے جاؤ امت مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

لیکن بایں ہمہ' عزیزم! ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جس قرآن کی رو سے ایک مرتبہ وہ نظام قائم ہوا تھا وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج پیدا کرتے ہیں جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنی ہے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝۹۶ (7:96) ''اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین وآسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے قوانین خداوندی کی صداقت کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔'' اس ایمان وتقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآن کریم سے ملے گی' بشرطیکہ تم اسے' تمام غیر قرآنی تصورات کو ذہن سے نکال کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ ❶

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں — سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

(اقبال)

والسلام

(نومبر 1939ء)

❁❁❁❁❁

❶ اسلام کا وہ ''مطلب'' جو بہتر فرقوں میں گم ہو گیا ہے تُو اس مطلب کو اس وقت تک سمجھ نہیں سکتا جب تک تیرے فہم وادراک پر کسی بھی فرقے کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ یعنی جب فرقوں سے آزاد ہو گا تو اسلام کا مقصد سمجھ میں آئے گا۔ (مدیر)

آغا شورش کاشمیری مرحوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عمرؓ

قرآن کے سانچے میں ڈھلا ہوا اِنسان

اصلاً یہ آغا شورش کاشمیری مرحوم کی ایک تقریر کے مختصرات ہیں' انہوں نے یہ تقریر آج سے کئی سال پہلے مولانا غلام مرشد سابق خطیب شاہی مسجد لاہور کے زیر صدارت بھاٹی دروازہ کے ایک جلسہ عام میں کی تھی۔ (ادارہ)

خلافت راشدہ کا عہد اور نظام' اسلام کے تصورِ ریاست کا بہترین نمونہ تھے' اور حضرت عمرؓ اس ریاست کے اظہار کی مثالی شخصیت۔ ساڑھے تیرہ سو برس ہو چکے ہیں لیکن اس حقیقت ثابتہ سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حضرت عمرؓ ہی اسلام کے تصور فرمانروائی کا حقیقی مظہر تھے۔ ان کے عہد سعادت گستر میں اسلام نے جو فتوحات حاصل کیں اور رسول اللہ ﷺ نے جس معاشرہ کی بنا رکھی' اس معاشرہ کو جو عروج واقبال حاصل ہوا' اپنے نتائج ومضمرات اور آثار ومقدمات کے لحاظ سے آج تک اس کی نظیر نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے آپؓ کی خواہش کی تھی۔ مسلمانوں کو آپؓ کے قبول اسلام سے جو طاقت حاصل ہوئی' وہ اظہر من الشّمس ہے' پہلا موقعہ تھا کہ کعبۃ اللہ کی چھت پر اذان دی گئی اور مسلمانوں نے باجماعت نماز ادا کی۔

> اسلام کے اس سب سے بڑے حکمران کے ذمہ رحلت کے بعد چھیاسی ہزار کا قرض تھا۔ جو ان کا مسکونہ مکان بیچ کر ادا کیا گیا۔ امیر معاویہؓ نے یہ مکان خریدا' باب اسلام اور باب الرحمت کے درمیان واقع تھا مدتوں دارالقضا کے نام سے مشہور رہا' یہ اس خلیفہ راشد کا حال تھا' جس نے بادشاہوں کے خزانے عربوں کے پاؤں میں ڈھیر کر دیے تھے

آپؓ کا زمانہ خلافت دس برس چھ مہینے اور چار دن رہا۔ فتوحات کے اعتبار سے یہ سارا عہد محیر العقول ہے مما لک محروسہ کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل سے بھی اوپر ہوگیا۔ جہاں تہاں مسلمانوں کا لشکر پہنچا' اس کی چھاپ گہری سے گہری ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ آپؓ کا دورِ خلافت اپنے آثار ونتائج کی ایک ایسی داستان ہے کہ اسلام کسی حالت میں بھی اپنے فخر وناز کی اس پونجی سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ کئی یورپی مصنفوں نے ان عالمگیر فتوحات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''عمرؓ چند سال اور زندہ رہتے تو دوتہائی کرۂ ارضی مسلمانوں کے زیر نگیں ہوتا۔ جہاں کہیں اسلام پہنچا۔ تمام آبادیاں مسلمان ہوگئیں' اس وقت کی مہذب دنیا کو اسلام کے آستانہ پر جھکنے کے سوا چارہ کار ہی نہ تھا۔''

آپ کی شہادت محرم کی پہلی کو ہوئی' ہفتہ کا دن تھا' تین دن پہلے 26 ذی الحجہ کو مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے' فیروز نام کے ایک پارسی غلام نے گھات میں سے نکل کر چھ وار کیئے۔ ایک ناف کے نیچے پڑا' آپؓ نے عبدالرحمن بن عوفؓ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور خود زخم کی تاب نہ لا کر گر پڑے' اپنے بیٹے سے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں جاؤ اور ان سے کہو' عمر حضور ﷺ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: میں نے یہ جگہ اپنے لئے رکھی تھی' اب عمرؓ چاہتے ہیں تو انہیں اجازت ہے' نماز جنازہ صہیب رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ حضرت علیؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت عبدالرحمنؓ' حضرت طلحہؓ' سعد بن وقاص اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے قبر میں اتارا۔

حضرت ابوہریرہؓ بحرین سے واپس آئے تو 12 ہزار روپے ساتھ تھے' ان سے یہ رقم لے کر بیت المال میں جمع کرا دی' فرمایا تم نے خدا کا مال چرایا ہے۔

اسلام کے اس سب سے بڑے حکمران کے ذمہ رحلت کے بعد چھیاسی ہزار کا قرض تھا۔ جو ان کا مسکونہ مکان بیچ کر ادا کیا گیا۔ امیر معاویہؓ نے یہ مکان خریدا' باب اسلام اور باب الرحمت کے درمیان واقع تھا مدتوں دارالقضا کے نام سے مشہور رہا' یہ اس خلیفہ راشد کا حال تھا' جس نے بادشاہوں کے خزانے عربوں کے پاؤں میں ڈھیر کر دیئے تھے اور جس کی سلطنت دور دراز تک چلی گئی تھی' بیت المقدس جو ان دنوں اسرائیل کے قبضہ میں ہے' اس کی فتح آپؓ ہی کے ہاتھوں مکمل ہوئی' اثنائے سفر میں شام سے قریب عمال وحکام کی ایک جماعت کو دیبا وحریر میں دیکھا تو غصہ میں آ گئے گھوڑے سے اتر گئے' ان کی طرف پتھر پھینکے' فرمایا: اتنی جلدی تم نے عجمی عادتیں اختیار کر لی ہیں' جس گھوڑے پر بیت المقدس گئے تھے' اس کے سم گھس کر بیکار ہو گئے۔ لوگوں نے ترکی گھوڑا پیش کیا' سوار ہو گئے' گھوڑا اُلیل کرنے لگا' فرمایا کم بخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سے سیکھی ہے؟ وہیں اُتر پڑے اور پیدل چل کر بیت المقدس میں داخل ہوئے' اس معمولی لباس میں تھے کہ مسلمان اپنے طور پر پریشان تھے کہ عیسائی کیا کہیں گے؟ لوگوں نے قیمتی پوشاک اور ترکی گھوڑا پیش کیا' فرمایا:

''خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے' وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے یہی بس ہے''۔

بیت المقدس میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے مسجد اقصیٰ ❶ میں گئے۔ حضرت بلالؓ سے کہا' اذان دیں' بلالؓ نے کہا میں فیصلہ کر چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی اور کے لئے اذان نہ دوں گا' آپؓ کا ارشاد سر آنکھوں پر اذان شروع کی تو

---

❶ مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ ہے نہ کہ بیت المقدس کی کوئی مسجد۔ حضرت عمرؓ نے ہیکل سلیمانی کے کھنڈروں کے قریب ایک کھلی جگہ نماز پڑھائی اور نماز کے وقت اپنا رخ بیت المقدس کی طرف نہیں بلکہ کعبہ کی طرف کیا۔ جس کھلی جگہ پر حضرت بلالؓ نے اذان دی اور حضرت عمرؓ نے نماز پڑھائی تھی وہاں عبدالملک بن مروان نے مسجد تعمیر کرا دی جسے مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں بیان کردہ مسجد اقصیٰ سے مراد عبدالملک کی تعمیر کردہ مسجد نہیں بلکہ مدینہ کا اسلامی مرکز ہے۔ (شاہکار رسالت۔ پرویزؒ)

فلسطین کی مسجد اقصیٰ کو اموی خلیفہ عبدالملک نے تعمیر کرانا شروع کیا جو اس کے اپنے بیٹے ولید کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی۔

حاضر صحابہؓ کو رسول اللہ ﷺ کا زمانہ یاد آ گیا' سب پر رقت طاری ہوگئی' ابوعبیدہؓ اور معاذ بن جبلؓ رونے لگے اور حضرت عمرؓ کی ہچکی بندھ گئی۔

آج وہی مسجد اقصیٰ اور اس کا صحن اسرائیل کی غزلہائے رواں کے جڑاواں ناچ سے داغدار ہو رہا ہے ؎

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

حکومت کیسی ہونی چاہئے۔ اس سوال پر کئی صدیوں سے غور ہو رہا ہے۔ ادھر مغرب کے سیاسی افکار کی بالادستی کو اصرار ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں انسانوں کو جو بنیادی حقوق ملے ہیں یا عوام کو اپنے حکمران منتخب کرنے کا جو حق حاصل ہوا ہے' وہ تمام تر مغربی افکار کی جدوجہد کا ثمرہ ہے' لیکن اس سوال کا جواب تیرہ صدیاں پہلے خلافت راشدہ کا نظام دے چکا ہے' رہ گئے حکمران تو ان کے اوصاف و اختیار کا پورا پورا نقشہ حضرت عمرؓ کی ذات میں منعکس ہو گیا تھا' آپ نے خلافت کی مسند پر بیٹھتے ہی جو خطبہ دیا' اس کا ایک ہی جملہ کافی ہے۔ فرمایا:

> عقبہ بن فرقدؓ نے کوئی لذیذ چیز پکوا کر بھجوائی' پوچھا کُل مسلمان یہی کھاتے ہیں' بولے نہیں' فرمایا: یہ تمہارے باپ کی کمائی نہیں کہ عیاشیوں میں برباد کرتے پھرو' حکم دیا' آئندہ وہی چیزیں کھاؤ' جو عوام کھاتے ہیں

اے خدا' میں سخت ہوں' مجھے نرم کر' میں کمزور ہوں' مجھے قوت دے۔

ایک حکمران کو جو ہونا چاہئے' اس کا تمام خلاصہ اس ایک فقرہ میں سما گیا ہے' جب تک مسند خلافت پر فائز رہے' ان کی سیرت کا یہی شعار رہا' قیصر روم کا سفیر حاضر ہوا تو حیران رہ گیا' اتنا بڑا کشور کشا ایک درخت تلے کھجور کی چٹائی پر آرام کر رہا ہے' اس نے واپسی پر بیان کیا تو سارا دربار ششدر رہ گیا۔۔۔ سفیر نے کہا:

''عمر اس معاشرہ کے فرمانروا ہیں' جس کے افراد دن کو مجاہد اور رات کو زاہد ہوتے ہیں' ان پر کسی شہنشاہ کا نہیں بلکہ ایک درویش کا گمان ہوتا ہے۔''

احتساب کا یہ حال تھا کہ ماتحت گورنر جو مختلف ملکوں کے مرکزی خلافت کے نمائندہ تھے' آپ کی ہیبت سے تھر تھر کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ گورنروں کے سامان کا جائزہ لیا تو جوتوں کا ایک ایک جوڑا چھوڑ کر باقی سارا سامان بیت المال میں بھجوا دیا۔

حضرت ابوہریرہؓ بحرین سے واپس آئے تو 12 ہزار روپے ساتھ تھے' ان سے یہ رقم لے کر بیت المال میں جمع کرا دی' فرمایا تم نے خدا کا مال چرایا ہے۔ عمرو بن عاصؓ مصر میں گورنر تھے' انہیں لکھا گورنر ہونے سے پہلا تمہارا اثاثہ اتنا تھا' اب اس سے زائد جتنا سامان فراہم کیا ہے' بیت المال میں جمع کرا دو۔

سعد بن عامرؓ بھی گورنر تھے۔ حاضر ہوئے تو ان کے پاس ایک تھیلہ' ایک لاٹھی اور ایک پیالہ تھا' آپؓ نے پوچھا: تمہارا سامان بس یہی ہے؟ کہا بس اتنا ہی' لاٹھی کے ساتھ ایک تھیلہ رہتا ہے اور پیالے میں کھانا کھا لیتا ہوں۔

عقبہ بن فرقدؓ نے کوئی لذیذ چیز پکوا کر بھجوائی' پوچھا کُل مسلمان یہی کھاتے ہیں' بولے نہیں' فرمایا: یہ تمہارے باپ کی

کمائی نہیں کہ عیاشیوں میں برباد کرتے پھرو' حکم دیا' آئندہ وہی چیزیں کھاؤ' جو عوام کھاتے ہیں۔

حضرت فارجہ بن حذافؓ نے مصر میں دو منزلہ مکان بنوایا' تو عمرو بن عاصؓ کو لکھ کر گروا دیا۔ فرمایا: اس سے ہمسایوں کی پردہ دری ہوتی ہے۔ ایران کے فاتح سعد بن ابی وقاصؓ نے کوفہ میں ایک محل بنوایا تو محمد بن مسلمہ (انسپکٹر جنرل پولیس) کو حکم دیا' جاؤ اور اس محل کو آگ لگا دو۔

عیاض بن غنم (حاکم مصر) کے متعلق رپورٹ پہنچی کہ ریشم پہنتا اور دربان رکھتا ہے' محمد بن مسلمہ کو حکم دیا' عیاض کو جس حالت میں پاؤ' اسی حالت میں پکڑ کے ساتھ لے آؤ' عیاض سامنے آیا تو باریک ریشمی کرتہ پہنا ہوا تھا۔ بالوں کا کرتہ پہنایا۔ بکریوں کا ایک گلہ حوالے کیا اور فرمایا تم انسانوں پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہو' جاؤ اور بکریاں چرایا کرو۔

کتاب الخراج میں لکھا ہے' گورنروں اور حاکموں سے عہد لیا کرتے تھے کہ:

(1) کبھی ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوں گے۔ (2) باریک کپڑا نہیں پہنیں گے۔

(3) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائیں گے۔ (4) چپڑاسی نہیں رکھیں گے۔

(5) ضرورت مندوں کے لئے دروازہ کھلا رہے گا۔

جس عامل کے متعلق معلوم ہوتا کہ کمزور اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ فوراً موقوف کر دیتے۔ کسی عامل کا تقرر کرتے وقت اس کے مال و منال کا حساب کر لیتے اور یہ واقعہ تو عام ہے کہ ایک بھوکی عورت اور اس کے بچوں کا حال دیکھا تو آٹے کی بوری اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے گئے۔ خدمت گار نے اصرار کیا' فرمایا قیامت کے روز پرسش میری ہوگی' تمہاری نہیں۔

ایک مرتبہ حضرت حفصہ نے سالن میں روغن زیتون ڈال کر سامنے رکھا تو فرمایا: میں دو غذائیں تا دمِ مرگ نہیں کھاؤں گا جبکہ عوام کو ایک غذا بھی میسر نہیں ہے۔

ایک مجلس میں پینے کے لئے پانی مانگا' شہد لے آئے ہاتھ میں پیالہ لے کر فرمایا: اگر میں اسے پی لوں تو اس کی مٹھاس چلی جائے گی' لیکن تلخی دیر تک باقی رہے گی۔ یہ کہا اور پیالہ واپس کر دیا۔

ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ میں گورنر تھے' آپؓ کے دو بیٹے ان کے پاس بصرہ گئے۔ ابو موسیٰ اشعری نے خزانہ سے کچھ رقم دی کہ اس سے مال خرید کر مدینہ میں بیچ دیں' جو منافع ہو' خود رکھ لیں۔ اصل خزانہ میں لوٹا دیں۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں سے پوچھا' کیا موسیٰ باقی لوگوں کے بیٹوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے ہیں یا صرف تمہیں خلیفہ کے فرزند سمجھ کر یہ رعایت دی ہے؟ اس کے بعد اصل اور منافع دونوں سرکاری خزانے میں جمع کرا دیئے۔

ایک دفعہ شام کے دورے پر گئے تو شہر کے نزدیک اپنے غلام سالم کو اونٹ پر سوار کرا دیا جو لوگ استقبال کے لئے موجود تھے حیران رہ گئے بلکہ کانا پھوسی کرنے لگے فرمایا: یہ لوگ شاہان عجم کے جلوس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور یہ تھا اسلام کا وہ مثالی حکمران جس نے اپنی حکومت اور اپنی ذات کو کھلی کتاب کی طرح رکھا' تنقید کا خیر مقدم کیا اور منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہو کر فرمایا:

''خدا اس شخص کا بھلا کرے جو مجھے میرے عیبوں کا تحفہ بھیجتا ہے۔ یعنی مجھے میری کوتاہیوں سے متنبہ کرتا ہے''۔

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

درسِ قرآن

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَہُوَ خَیۡرٌ لَّہٗ ؕ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾ (2:183-184)

لفظ صیام کا قرآنی مفہوم ''خود کو روکنا'' ہوتا ہے:

احکام کی اطاعت کے لیے حدود کی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرنا پڑتی ہیں۔ اطاعت کے تو معنیٰ یہ ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ میرے جو جی میں آئے، میں اس وقت کر دوں۔ آپ کو اس وقت رکنا پڑتا ہے، اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔ یہ جو اپنے آپ کو روکنا ہوتا ہے، عربی زبان میں اس کو صیام کہتے ہیں، جس کا ترجمہ روزہ ہے۔ اب اگلی آیت صیام کے متعلق ہے۔ آپ نے دیکھا کہ صیام کی آیت کہاں آئی ہے۔ کہا ہے کہ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:183)۔ ان احکام کی پابندی کیسے ہوگی؟ ایک تو پابندی ہے سپاہی کا ڈر۔ اور سپاہی کے ڈر سے جو پابندیاں ہوتی ہیں، ان کا حشر تو ہم نے گزشتہ تین چار مہینوں میں دیکھ لیا تھا۔ کسی مملکت کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر فرد کے سر پہ ایک سپاہی کھڑا کر دے۔ اور اگر سپاہی اور مجرم ایک ہو جائیں تو پھر کیا ہوگا؟ اور پھر بسیار شیوہ ہا بتاں را کہ نام نیست۔ سپاہی تو اس جرم کی Detection کرے گا جو سرزد ہو گیا ہو۔ اور سرزد ہونے سے پیشتر جو آپ کے اندر اس کے لیے سازشیں ہو رہی ہوں، تدبیریں ہو رہی ہوں، بدنیتیں ہو رہی ہوں، خرابیاں پیدا ہو رہی ہوں، اس کے اوپر تو کسی کی نگاہ ہی نہیں جا سکتی۔ لہٰذا یہ نظامِ مملکت، یہ سپاہ، یہ فوج، یہ ضروری چیزیں 'صرف ان کے لیے ہیں جو اپنے اوپر پابندیاں عائد نہ کرنا چاہیں۔

مقامِ مومن کی بنیادی خصوصیت: حکمِ خداوندی کی ہر آن پابندی ہے:

قرآن کا نظام یہ ہے، مومن وہ ہے جو اپنے اوپر خدا کی بتائی ہوئی پابندیاں خود عائد کرتا ہے، اسے صیام کہتے ہیں۔ صام کے معنی ہی ہوتا ہے ''سرکش گھوڑے کو لگام کے ذریعے سے روک لینا''۔ گھوڑے کو گولی مار کر فنا کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کی سرکشی نکال دینا ہے، تاکہ اس کی قوتوں کو قاعدے اور ضابطے کے مطابق استعمال کیا جائے۔ قرآن نے صرف صیام کہا ہے۔ آپ کے ہاں عجمی تصوف آیا، اس نے کہا کہ نہیں! یہ جتنے جذبات، یہ آرزوئیں، یہ تمنائیں، جو سینے میں بیدار ہوتی ہیں، یہ سب شیطنت اور ابلیسیت ہے۔ مقصدِ حیات نفس کشی ہے، مار دو ان سب کو۔ یہ نفسیاتی طور پر ناممکن ہے۔ آپ اپنے کسی جذبے کو فنا

نہیں کر سکتے' اس کو دبا سکتے ہیں۔ اور جب آپ دبائیں گے تو وہ باہر آنے کے لیے Un-Natural (غیر فطری) راستے اختیار کرے گا۔ اسے Perversion (بدنہادی) کہتے ہیں۔ وہ سعدی شیرازی (1184-1291) کہہ گیا:

پری رو تابِ مستوری ندارند

جن کے اندر حسن کی نمود کا جذبہ ہوتا ہے ان کو آپ بند کیجیے تو وہ چھپ کر نہیں رہتے

چوں در بندی زِ روزن سر بر آرند [1]

دروازہ بند کرو تو وہ کھڑکی میں سے جھانکنے لگ جاتے ہیں۔

تصوف کی انتہا انسانی جذبات کی پامالی یا نفس کشی ہے جو کہ ایک سعیٔ لا حاصل ہے

اگر آپ جذبات کو کچلنا شروع کریں گے' جو آپ کے ہاں تصوف کا' نفس کشی منتہا ہے تو یہ مر نہیں سکتے' یہ غلط راستوں سے نکلنا شروع کر دیں گے۔ اور اگر آپ نے کہیں ان کی تاریخیں پڑھی ہوں' خواہ وہ [2] Twelve Years in a Monastey ہو' یہ چھوٹی سی بڑی عمدہ کتاب ہے' وہاں سے تصوف آپ کے ہاں آیا ہے۔ یا آپ کے ہاں جو زوایئے یا خانقاہیں ہیں' ان کے ہاں کے حالات ہوں۔ جہاں کہیں بھی یہ ہوگا' آپ دیکھیں گے کہ وہاں Perversion (بدنہادی) ہی Perversion (بدنہادی) ہوگی۔ فطرت کے صحیح راستوں کے ذریعے سے تقاضوں کو پورا کر دینا' ان پابندیوں کے تابع رہتے ہوئے' جو خدا نے ان تقاضوں کو پیدا کرنے والے خالق نے عائد کی تھیں' یہ فطرت کے مطابق ان تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ جونہی آپ نے اس کے خلاف کچھ پابندیاں عائد کیں اور ان کو مارنے کی کوشش کی' یہ سانپ کے بچوں کی طرح ہزار راستوں سے اپنا سر نکالیں گے۔ یہ Perversion ہوتی ہے' یہ بدنہادی ہوتی ہے۔

قرآن نے صیام کہا' روکنا کہا ہے۔ ٹھیک ہے جہاں تک ایک متعین چیز کا نام ہے' وہ تو یہی ہے جسے ہم روزہ کہتے ہیں لیکن یہ اس کی ایک شکل ہے۔ صیام کے تو معنی یہ ہیں کہ ہر وہ چیز' یعنی پہلی چیز تو یہ ہے کہ جو ناجائز ہے' حرام ہے' اس سے مستقل طور پر رکنا ہے الا اضطراری حالت کے۔ اگلی چیز یہ ہے کہ جن عام حالات میں جو چیزیں بالکل جائز اور حلال وطیّب ہیں' ایسے مواقع' ایسے حالات' آ سکتے ہیں کہ ان سے بھی رکا جائے۔ یہ جو ان سے رکنے والی بات ہے' اسے صیام کہا جائے گا۔ اور جس قوم نے مسلسل جہاد کرنا ہو' جس نے ساری دنیا کے خلاف اپنی مدافعت کرنا ہو' اور حق کو نافذ کرنا ہو' مسلسل جہاد کرنے والی قوم کے لیے تو اس قسم کی پابندیوں کی' ڈسپلن کی' نہایت ضرورت ہے۔ ہمارے سامنے ایک فوج کا ہی کام آتا ہے کہ میدان میں جاتے ہیں اور وہ ڈز اور ڈز مارتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے سے پیشتر جتنے مقامات ان کے ہوتے ہیں' وہ ہمارے

---

[1] (سکندر علی) جگر مراد آبادی (1890-1960) نے اس نفسیاتی کشمکش کا نقشہ' اپنے مخصوص انداز میں کچھ یوں کھینچا ہے۔

کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ آہ! سر جھکائے نہ بنے' آنکھ اٹھائے نہ بنے

[2] اس کا پورا حوالہ یہ ہے: McCabe, Joseph (1930) Jwlve years in a Monastery London: C.A Watts & Co, Limited

سامنے نہیں ہوتے۔ یہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ فوج کو اتنی بڑی آزادی ہوتی ہے کہ میدانِ جنگ ہے، ہاتھ میں ان کے بندوق پکڑی ہوئی ہے اور وہ بھاگ رہے ہیں، اس کو مارا، اس کو مارا، نہ کوئی قاعدہ، نہ کوئی قانون۔ آپ کو پتہ نہیں کہ ان کی Life (زندگی) کتنی Disciplined (پابندِ قواعد وضوابط) ہوتی ہے؟ قاعدے اور قانون کی صورت یہ ہے کہ اس میدانِ جنگ کے اندر بھی جہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسے کامل آزادی ہے، سپاہی کے سر کے اوپر اور کھڑا ہوتا ہے، وہ وہاں یہ دیکھ رہا ہوتا کہ بندوق اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہے یا بائیں میں پکڑی ہے۔ ان پابندیوں ہی سے اختیار حاصل ہوتا ہے، یاد رکھو۔ جس قوم نے مسلسل مجاہد پیدا کرنے تھے اور وہ یہ نہیں ہے کہ الگ کوئی جماعت پیدا کرنی تھی، یہاں ہر مومن کو مجاہد ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے تو بڑی پابندیاں لگانی پڑتیں۔ اور یہ پابندیاں یہ نہیں ہیں کہ باہر سے کوئی حکم دے کر Impose (عائد) کرے گا، اپنے اوپر خود عائد کی جائیں گی۔ مومن تو کہتے ہی اس کو ہیں جو ان پابندیوں کو اپنے اوپر عائد کرے گا۔ اور یہ ہے وہ ٹریننگ جو آپ کو سال میں فوج کے لیے Reserve رکھے ہوئے ہوتے ہیں، وہ اپنا کام کاج کرتے رہتے ہیں اور سال میں ایک آدھ مہینہ تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ آ کر جو ٹریننگ کا ریفریشر کورس ہے اس میں داخل ہو جائیں۔ یہ آپ کے ہاں، ایک مہینہ، آپ کے مجاہدین کے لیے، سال کے بعد Reserve کے لیے، ریفریشر کورس ہے۔

مومن کی مصروفیات کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان

مومن کی تو زندگی یہ تھی جو حضور نبی اکرم ﷺ نے فرما دی۔ پوچھا کہ مومن کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب قتال ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو، جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ تیاری میں مصروفیت تو ان پابندیوں سے ہوتی ہے۔ کبھی کبھی فرصت ملے تو ان فوجیوں کی ٹریننگ دیکھ آیا کیجیے لیکن یہ تو وہ دیکھنے جائے جس نے اپنے اوپر کوئی پابندی عائد کرنی ہو۔ جس میں عائد شدہ پابندی کی بھی یہ کیفیت ہو کہ سائیکل پہ جا رہا ہے، سامنے سے موڑ آیا ہے یہ Keep to the left (بائیں چلو) قانون ہے۔ دور سے سر اٹھا کر دیکھے گا اگر تو اسے وہ لال پگڑی والا نظر آ گیا تو پھر تو نہایت قاعدے کے مطابق بائیں طرف چلا جائے گا، بڑے مہذب شریفانہ انداز سے، پرامن شہری چلے جا رہے ہیں۔ اور اگر وہ نہیں ہے اور دائیں طرف جانے سے کوئی دو پاؤں سائیکل کے اوپر بچ سکتے ہیں، زیادہ سے زیادہ وہاں جانے کے بعد دیکھے گا کہ نہیں ہے، اگر وہ کھڑا ہوا نہیں ہے تو سیٹی بجاتے ہوئے یوں نکل جائے گا جیسے قلعہ فتح کر کے آ رہا ہے۔ جس قوم نے اپنے ہاں یہ کیفیت پیدا کر لی ہو، وہ ان فوجیوں کی ٹریننگ کا ہے کے لیے دیکھنے کے لیے جائے۔

جماعتِ مومنین کے لیے ریفریشر کورس کے مہینے میں (روزوں کے مہینے میں)

پابندیوں کو برداشت کرنے کا نتیجہ

برادرانِ عزیز! سال کے بعد آپ کے ہاں ریفریشر کورس کا ایک مہینہ تھا۔ اور اس میں ٹریننگ کس قسم کی ہوتی تھی اس کا

ثبوت یہ ہے کہ سن 2 ہجری میں روزے فرض ہوئے' ابھی سترہ دن کے روزے رکھے تھے کہ بدر کے میدان میں یہ مجاہدین چلے گئے اور تین سو نے ہزار کے اوپر وہ فتح پائی کہ قرآن نے اس کو یوم الفرقان کہا ہے۔ سترہ دن کے روزوں کا یہ نتیجہ تھا۔ اور انہی کو حق حاصل تھا کہ آ کر پھر عید منائیں۔ اب یہاں کروڑوں کی تعداد کے اندر تو ساری دنیا میں مسلمان روزہ رکھتا ہی ہے۔ اس روزے سے جو پابندی اپنے اوپر عائد کرنی تھی' وہ پابندی تو صاحب چھوڑ دیجیے' یہ تو آپ نے سنا ہوگا خاص طور پہ گرمی کے دنوں کے جو روزے ہوتے ہیں' اور عصر کے وقت روزے دار کے قریب جائیے اس سے کچھ بات کیجیے تو وہ اس وقت یہ کہتا ہے ''پئی میرے نال ایس ویلے گل نہ کریں' میں روزے نال آں یعنی دند باہر کڈ دیاں گا ❶''۔ روزے دار کے قریب ہو کر دیکھیے' شارٹ مارتا ہے ''ساری دنیا نال لڑن ڈیا ہے' او تینوں پتہ نئیں میں روزہ رکھیا ہویا ہے ❷''۔ یہ تھی Self Imposed Discipline (نظم و ضبط خود عائد کرنے) والی قوم کی کیفیت۔ برادرانِ عزیز! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعداد کے اعتبار سے دیکھیے تو ان تین ❸ سو کے مقابلے میں شاید لاکھ گنا زیادہ روزے رکھنے والے ہیں' نتیجے کے اعتبار سے دیکھیے کہ وہ تین سو نے ہزار کو فتح کر لیا' یہاں تین آتے ہیں ہزار ہزار کو مار کر چلے جاتے ہیں اور یہ ہے اپنے اوپر خود عائد کردہ پابندیوں والی اس نامِ نہاد قوم کی کیفیت۔

مجرمین کے بالمقابل دوسرا شخص اپنے اوپر خود پابندی عائد کرتا ہے

برادرانِ عزیز! قرآن کہتا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) کیا بات ہے قرآن کی! کہ خدا اس قدر عظیم قوتوں کا مالک ہے' اگر چاہتا تو جس طرح خارجی کائنات میں اس کا نظام از خود قائم ہے' انسانی دنیا میں بھی از خود ہو جاتا اور انسان اس کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا لیکن اس باب میں وہ زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ اسے انسان کو اپنے دل کی رضامندی سے قائم اور اختیار کرنا ہے۔ Super Imopsed (خارج سے عائد) پابندی تو مجرم کے اوپر عائد کی جاتی ہے۔ شریف انسان اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (2:183)۔ یہ صیام کوئی نئی بات نہیں ہے جہاں جہاں بھی ہم نے مجاہدین تیار کیے تھے' اس سے پیشتر انبیائے کرامؑ تھے' ان کی امتوں سے بھی یہی کہا گیا تھا۔ یہ تو ازل سے حق و باطل کی لڑائی چلی آ رہی ہے۔ ازل سے اس قسم کے جو حزب اللہ ہیں' وہ تیار ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ان پر بھی یہ پابندیاں ہم نے عائد کی تھیں۔ کاہے کے لیے یہ پابندیاں عائد کیں؟ واعظ کو آپ نے دیکھا کہ روزے کے احکام بیان کر رہا ہے ''پانی پین ڈیا ہے ❹'' ہر واعظ یہی کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ روزہ کیوں رکھا ہے؟

---

❶ مجھ سے اس وقت بات نہ کرو۔ میں روزے سے ہوں یعنی دانت باہر نکال کر رکھ دونگا۔ ❷ سب سے لڑ رہا ہے۔ (کہتا ہے کہ) کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ ❸ یہ کفار کے مقابلے میں میدانِ بدر میں آنے والے تین سو مجاہدین کی طرف اشارہ ہے۔ ❹ پانی پی رہا ہے۔

قدرت نے حضرتِ انسان کے لیے غیر متبدل اصولوں کے ساتھ ساتھ ان مستقل اقدار کی حقانیت کو قدم قدم پر واضح بھی کیا ہے

آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ہم نے کتاب اور حکمت نازل کی۔ کتاب تو قانون کو کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اس کے ساتھ یہ حکمت بھی نازل کی ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ ہمارے ہاں عام طور پہ ایک شکایت ہوتی ہے کہ صاحب! یہاں جب کوئی حکم نافذ ہوتا ہے تو یہ نہیں بتایا جاتا کہ ہم یہ کیوں نافذ کر رہے ہیں' کیا ضرورت پڑ گئی تھی' اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ What is The why of it۔ عزیزانِ من! بڑا اطمینان ہو جاتا ہے اگر آپ دوسرے کو Rationally (حکمت سے) سمجھا دیں کہ یہ یوں کہہ رہے ہیں۔ گھر کے بچے کو آپ ایک جگہ حکم دے کر دیکھیے کہ بیٹھ اوئے! یوں نہیں کرتے۔ اور دوسرے وقت میں یا دوسری جگہ یا دوسرا باپ اس بچے کو سمجھائے کہ دیکھو بیٹا! یہ یوں نہیں کرتے' اس کا یہ نقصان ہوتا ہے' ایسا کر لینے سے یہ فائدہ ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو آپ کے احکام کی تعمیل ہوتی ہے ان دونوں صورتوں میں انہیں کتنا فرق پڑتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ ہر وقت محسوس کرتا ہے کہ ہاں صاحب!'' ٹھیک ہے جی! پیو جے ہویا' مننا ہیگا وے' روٹی کھان نوں دیندا اے نہ مناں گے تے تھپڑ مارے گا[1]''۔ ہر وقت اس کے خلاف Revolt (بغاوت) ہوتی ہے۔ اور اگر آپ ذہنی طور پہ اس کو مطمئن کر دیتے ہیں' Rationally Explain (فکری طور پہ وضاحت) کر دیتے ہیں' The why of that order of yours (اپنے اس حکم کی وجۂ جواز) بتا دیتے ہیں تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اسے حکمت کہتے ہیں۔ یہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو حکمت ہے' یہ منزل من اللہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ منزل من اللہ کیوں ہے؟ اس میں بڑی گہری چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آپ کو ایک دوائی دی' کہا کہ چار چار گھنٹے کے بعد یہ پیتے جانا۔ یہ تو ہے کتاب' یہ تو ہے حکم' یہ تو ہے قانون۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پیتے جایئے' شام کو چھ بجے آپ دیکھیں گے کہ آپ کا بخار اتنا کم ہو جائے گا' یہ پیجیے تاکہ بخار کم ہو جائے۔ اگر ڈاکٹر صاحب یہ نہ بتائیں تو آپ پیے جائیں گے' آپ کو کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ دوائی نے وہ اثر کیا ہے یا نہیں کہ جو ہونا چاہیے تھا۔ اگر انہوں نے کہہ دیا ہے' اگر چار گھنٹے کے بعد آپ کا بخار اتر جائے گا تو چار گھنٹے کے بعد آپ کھڑے ہو کر دیکھیں گے' اگر تو وہ اترا ہے تو ٹھیک ہے' تشخیص ٹھیک ہے' دوائی ٹھیک ہے' اس نے اپنا نتیجہ دکھا دیا۔ اگر بخار نہیں اتر رہا تو آپ اس کے بعد فوراً ڈاکٹر صاحب سے کہیں گے۔ ڈاکٹر صاحب بھی پھر دوبارہ کھڑے ہو کر سوچے گا' تشخیص میں غلطی ہوئی' دوائی تجویز کرنے میں غلطی ہوئی یا خود دوائی ہی غلط مل رہی ہے۔ یعنی اگر وہ متعین نتیجہ نہیں نکل رہا ہے جس کے لیے کہا تھا کہ ایسا کرو تو پھر وہ اس کو Continue (جاری) نہیں کرتا جائے گا' یہ کیفیت نہیں ہوگی کہ

نہ دکھ جائے' نہ درماں راس آئے   مگر خبطِ دوا ہے' اور میں ہوں

---

[1] ٹھیک ہے جی! باپ جو ہوا۔ اسے ماننا ہے' ہمیں کھلاتا پلاتا ہے۔ اگر اسے نہیں مانیں گے تو تھپڑ رسید کر دے گا۔

مگر وہ ہے کہ پیے جا رہا ہے۔ او کیوں پیے چلا جا رہا ہے؟ ''ڈاکٹر صاحب نے جو کہیا سی''۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا لَعَلَّكُمْ تا کہ یہ ہو جائے۔ او یہ نہیں ہو رہا' کھڑے ہو جاؤ' کیوں خوامخواہ پیے چلے جا رہے ہو۔ آپ یہ کبھی نہیں کرتے کہ پیے چلے جائیں لیکن آپ نماز پڑھے جائیں گے' روزے رکھے جائیں گے۔ کیوں؟ کہ جی! یہ حکمِ خداوندی ہے۔ بھئی! اس نے تو ساتھ کہا تھا لَعَلَّكُمْ (2:183) تا کہ یہ ہو جائے۔ تو کھڑے ہو کر کبھی دیکھو کہ جو اس نے کہا تھا ہو جائے وہ ہو رہا ہے۔ برادرانِ عزیز! آپ نے سوچا کہ کیوں قرآن نے خود حکمت کو بھی ساتھ بتا دیا۔ اگر وہ یہ نہ بتاتا تو ہم اپنے آپ کو مطمئن کر کے بیٹھ جاتے کہ ہو رہا ہے۔ ہمارے پاس کوئی Objective Standard (خارجی معیار) کوئی معیاری کسوٹی' کوئی تھرمامیٹر ہوتا' جو بتا دیتا کہ مریض کا بخار کم ہو گیا ہے۔ یہ جو اپنے متعلق خود ہی فیصلہ کر لینا ہے کہ وہ ٹھیک ہو رہا ہے' یہ فریبِ نفس ہے۔

مذہب کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو نتائج حاصل کیے بغیر اُسے خود فریبی میں الجھائے رکھے

مذہب فریبِ نفس دیتا ہے۔ ہر فرد خود فیصلہ کر لیتا ہے' اور اپنے ہی زعم میں مقرب بارگاہِ خداوندی بنتا چلا جا رہا ہوتا ہے۔ خوابوں میں دیدارِ الٰہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہاں سے نیچے اتر یئے وہ اربابِ شریعت ہوتا ہے جی! اس سے ہوتا کیا ہے؟ ثواب ہوتا ہے' جی! تا کہ کوئی بتا ہی نہ سکے کہ یہ ثواب ہوتا کیا ہے۔ قرآن لَعَلَّكُمْ (2:183) کہتا ہے تا کہ یہ ہو جائے۔ اور وہ اس دنیا کے اندر ہونے والی بات بتاتا ہے۔ کہتا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)۔ عزیزانِ من! تین آیات کے اندر آپ دیکھیے اور پھر قرآن کو دیکھیے کہ اس نے حکمت کیوں خود نازل کی تھی؟ تا کہ تم کبھی فریب میں نہ رہو کہ ویسا نہیں ہو رہا اور کرتے چلے جاؤ۔ اگر ویسا نہیں ہو رہا تو کھڑے ہو کر سوچنا پڑے گا۔ یہ بات تو نہیں ہو گی کہ ہم یہ دیکھیں کہ تشخیص غلط تھی (معاذ اللہ)۔ وہ تو خدا کی تشخیص ہے۔ دوائی غلط تجویز ہوئی تھی (معاذ اللہ)۔ خدا کی تجویز کردہ ہے۔ نتیجہ نہیں برآمد ہو رہا' ہم میں کوئی نقص ہے۔ نسخہ صحیح نہیں بنوا رہے' ہمارے پاس دوائی صحیح نہیں آ رہی۔ نہ ڈاکٹر میں نقص ہے' نہ اس کی دوائی تجویز کرنے میں نقص ہے' مجھ میں کوئی نقص ہے' جس کی وجہ سے نتیجہ نہیں پیدا ہو رہا۔

قانون کے ساتھ حکمت انسان کے ارادے کو عمل کے میدان میں استقامت عطا کرتی ہے

عزیزانِ من! یہ ہے منزل من اللہ ہونے کی حکمت۔ یہ فریب نہیں ہے۔ دین میں کتاب اور حکمت دونوں دوش بدوش چلتی ہیں تا کہ ہر قدم پہ کھڑا ہو کر یہ دیکھ لے کہ نتیجہ وہ نکل رہا ہے' ویسا ہو رہا ہے جیسا اس نے کہا ہے۔ اور یہ ہے حکمت قرآن کی۔ جہاں اس نے قانون دیا ہے اس کے ساتھ لَعَلَّكُمْ (2:183) کہا ہے۔ آپ پھر قرآن میں دیکھیے گا آپ کو پتہ چلے گا کہ حکمت کیا شے ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183) تم پر روزے فرض کیے گئے۔ میں نے کہا ہے کہ دو آیات کے اندر تین بار لَعَلَّكُمْ (2:183) آیا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:183) تا کہ تم قوانین کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو جاؤ۔ حلال وطیب چیزوں کے استعمال کے اوپر ایک پابندی عائد کی ہے اور کہا ہے کہ تم خود

پابندی عائد کروتا کہ جن چیزوں پر چلنے کے لیے روکا گیا ہے اس سے خودتمہارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوجائے۔ جب میں نے جو جائز کمائی ہے' اس سے حاصل کردہ رزق بھی اپنے لیے کہہ دیا کہ میں نے آج یہ روٹی نہیں کھانی تو اس سے تمہارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوجائے گی کہ حرام کا جو رزق سامنے آئے گا تم اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ آپ کو یہ بھی یاد ہے کہ یہ روزے کی چار آیات ہیں' ان چار آیات کے بعد جو آپ کو کہا ہے وہ کیا کہا ہے؟ یہ کہ وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (2:188) او! یہ سارا کچھ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھا جایا کرو۔ یہ ہے لَعَلَّكُمْ۔

اپنے آپ کو بدعملی کے نتائج سے محفوظ رکھنے کا نام تقویٰ ہے

غور کیجیے گا قرآن کی حکمت کیا ہے۔ کہتے ہیں صاحب! کہ یہ آیات یونہی جوڑ کر رکھ دی ہوئی ہیں' کوئی ترتیب یا ربط تو ان میں ہے نہیں۔ آپ ربط دیکھتے ہیں' ان کو اس میں کیا نظر آئے جنہوں نے روزہ رکھ کر باطل کا مال کھانا ہو۔ ربط تو یہ تھا۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:183) یہ غلط قدم اٹھانے کے مضرت رساں انجام کا ڈر ہے جسے تقویٰ کہتے ہیں: نہ بھئی! یہ کیا' تو یہ ہوجائے گا' کہا ہے تا کہ تمہارے اندر اس کی استعداد پیدا ہوجائے۔

میں وہ پھر ٹریننگ کہوں گا جو فوجی کو سال بھر ملتی ہے یعنی ان کے پاس کھانے کے لیے ہوتا ہے' پانی ہوتا ہے' یہ پندرہ پندرہ میل سپاہی کو دوڑاتے ہیں حالانکہ موٹریں ساتھ ہوتی ہیں مگر یہ ان کو دوڑاتے ہیں۔ اور اس میں ہوتا یہ ہے کہ پانی نہیں پینا' کچھ نہیں کھانا۔ بھئی کیوں؟ اس لیے کہ کل کو جب میدانِ جنگ میں جانا ہے تو یہ تربیت اس وقت کام آئے گی۔

روزے فرض کرنے کا مقصد انسان میں نہایت استقامت کے ساتھ قانون کی پابندی کی استعداد پیدا کرنا ہے

1965ء کے میدانِ جنگ میں ہم نے دیکھ لیا کہ چھ چھ دن تک یہ سپاہی ان مورچوں کے اندر بغیر دانے اور پانی کے بیٹھے رہے۔ یہ نتیجہ تھا اس ٹریننگ کا جو ان کو جنگ کے علاوہ امن کے زمانے میں ملی تھی۔ کہا کہ اپنے اوپر یہ پابندیاں امن کے زمانے کے اندر Impose (عائد) کیا کرو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:183) تا کہ تم میں قانون کے پابند ہونے کی استعداد پیدا ہوجائے۔ قانون کی پابندیاں عائد کردیں۔ کیا ہوا اس کے لیے؟ میں نے کہا تھا کہ یہ تو مجاہدین کا ایک پروگرام ہے۔ یہ جہاد کا ہے کے لیے ہے؟ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) تا کہ جو تمہیں ہدایت اور راہنمائی دی گئی ہے' اس کی بنا پر تمہارے خدا کا قانون دنیا میں سب سے بلند رہے اس لیے یہ صیام فرض کیے گئے ہیں۔ صیام کا کیا پروگرام ہے؟ لَعَلَّكُمْ کیا ہے؟ قانون کیا ہے اور اس کی حکمت کیا ہے؟ اس سے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) ہوگا' اس سے

Self Discipline (ضبطِ خویش) ہوتا کہ اس دنیا میں خدا کے نظام اور قانون کو کبریائی حاصل ہو جائے۔ دیکھ رہے ہیں آپ کہ یہی نتیجہ سامنے نکلتا ہے یا نہیں؟ کروڑوں کی تعداد میں صیام کی اتنی پابندی ہے کہ صاحب! اگر عید کے چاند کے متعلق کہیں ہو گیا ہے کہ وہ چاند نہیں ہوا' دوسرے دن روزہ نہیں رکھا گیا تو قیامت برپا ہو گئی' شریعتِ حقہ تباہ ہو گئی کہ ایک روزہ رکھنا تھا اور انہوں نے نہیں رکھا یا۔ آپ کو پتہ ہے جو کچھ قیامتیں یہاں بپا ہوا کرتی ہیں ''تے انتیس رکھ کے کیہڑا خیبر فتح کر لیا سی' جیہڑا اتیس رکھ کے کرلو گے۔ جیویں ستیا ناس ایویں سوا ستیا ناس ❶ ''۔ یہاں (بدر کے میدان میں) تو سترہ روزے رکھنے کے بعد لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) ہوا تھا۔ پوچھو بدر کے میدان سے کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ کہا کہ یہ کرو۔ اور اس کے ساتھ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2:185) تا کہ تمہاری محنت رائیگاں نہ چلی جائے' بھرپور نتائج پیدا کرے' اس لیے یہ کچھ کرو۔

عزیزانِ من! یہ بھی تو ہوتا ہے کہ محنت بھی آدمی کرتا ہے' وقت بھی دیتا ہے' نیک نیت بھی ہوتا ہے لیکن کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہوتی ہے' بھرپور نتائج نہیں پیدا ہوتے۔ کہا کہ یہ جو جزئیات کے اوپر ہم نے کہا ہے کہ نگاہ رکھو' اس میں جزئیات کیوں ہیں؟ وہ اس لیے دی ہیں۔ برادرانِ عزیز! وہ چیزیں دو تین آیات میں آ گئیں۔ پہلی چیز تو یہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (183:2) ہے کہ ہر قانون کی نگہداشت کرنے کی صلاحیت خود پیدا ہو جائے۔ یعنی یہ With effort (کوشش سے) نہ کرنا پڑے' آپ کے اندر کی یہ چیز ہو جائے کہ خود بخود آپ اس کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔ پھر سپاہی کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خود بخود اطاعت کرنے لگتا ہے۔ اطاعت کی چیز کے لیے تو مجھے ایک سپاہی دوست کا وہ فقرہ پسند آیا۔ بریگیڈیر کہتا ہے کہ اطاعت کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ مجھے تو اپنے اردلی کی بھی اطاعت کرنی پڑتی ہے جب وہ صبح آواز دیتا ہے کہ صاحب! پانچ بج گئے ہیں' صاحب کو کتنی ہی نیند کیوں نہ آئی ہو' مجھے اٹھنا ہوتا ہے۔

وہ بڑی بات کہہ گیا ہے۔ Self Discipline (ضبطِ خویش) کا جذبہ' اس کے اندر اتنا سرایت کر جاتا ہے کہ پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! کہ از خود تم قانون کی پابندیاں کرتے چلے جاؤ' اس لیے تمہیں یہ کہا ہے۔ کیوں پابندیاں عائد کرتے چلے جاؤ؟ یہ نہیں ہے کہ ہمارا حکم ہے' حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کہ ''صاحب نے کہہ دتا جی' مننا ہیگا' کی کِتا جائے؟'' لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (185:2) دنیا میں کبریائی صرف نظامِ خداوندی کے لیے ہو جائے۔ اور جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو اس کبریائی کو قائم کرنے کے لیے تم جو کوشش کرو وہ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (185:2) بھرپور نتائج کی حامل ہو۔ یہ سب اس لیے ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔

---

❶ 29 روزے رکھ کر کونسا خیبر فتح کیا ہے جو تیس رکھ کر کر لو گے۔ جیسے ستیاناس اسی طرح سوا ستیاناس۔

❷ صاحب نے کہہ دیا ہے۔ اسے ماننا ہی ہے' اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پرویزؒ کی طرف سے' الزام تراشی کا جواب

عزیزانِ من! یہ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ (2:184) چند گنتی کے دن ہیں۔ یہ گنتی کے دن کیا ہیں؟ ساری آیات سامنے آئیں گی تو ان میں عرض کروں گا لیکن عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔شور اُٹھتا ہے کہ صاحب! یہ نو دن کے روزے ہیں' کوئی کہتا ہے کہ تین دن کے روزے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کن کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں؟ محاورۃً کہتا ہوں کہ جو بلا آسمان سے آتی ہے خانۂ انوری کی طرف ہوتی ہے۔ ایک پرویز ان کو مل گیا ہے جو ان کے قول کے مطابق کہتا ہے کہ تین نمازیں پڑھو۔ جی! کہاں کہتا ہے؟ کہاں لکھا ہے اس نے؟ جی کہتا ہے۔ جی! وہ تو نہیں کہتا؟ ''ساری دنیا کہندی اے۔ او کہندی اے ساری دنیا' پھاپے اینوں دے [1] دیو''۔ یہ کہتا ہے کہ جی نو دن کے روزے رکھو۔ برادرانِ عزیز! میں یہ چیز اللہ کی بارگاہ میں' شکرانے کے طور پہ کہتا ہوں کہ یہ میں تھا جس نے یہ کہا تھا کہ قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا ہوا کہ تین یا نو دن کے روزے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَـصُمۡهُ (2:185) جو تم میں سے اس مہینے میں گھر پہ موجود ہو فَلۡيَـصُمۡهُ (2:185) وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ اس کے لیے یہ مہینہ روزوں کا ہو۔ میں نے یہ کہا تھا کہ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ روزوں کا مہینہ ہے۔ خیر قرآن کہتا ہے کہ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ (2:184) یہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں۔ گنتی کا تعین' بجائے خویش' ڈسپلن پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

روزوں کی گنتی کے پورا کرنے کے متعلق قرآن کریم کا حکم

عزیزانِ من! مجھے ایک اور اہم بات کہنی ہے اس میں' خواہ اس کے لیے پانچ منٹ زیادہ ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ سنیے! قرآن نے رمضان کے متعلق ایسی تفصیل دی ہے' کم احکام ہیں جن کی تفصیل آئی ہے۔ نماز کی تو قرآن میں زیادہ تفصیل نہیں آئی' کہا ہے کہ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ (2:184)۔عزیزانِ من! پہلے یہاں دیکھیے آیا ہے کہ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ (2:184)۔ اس کے معنی عام طور پہ یہ کیے جاتے ہیں کہ جو تم میں سے اس مہینے میں زندہ ہو' وہ روزے رکھے۔ اندازہ لگاؤ کہ ''جیہڑا مر گیا ہیگا اے' اوہدے لئی وی کہن دی لوڑ ہیگی [2] ؟'' عربی زبان میں شھد کہتے ہیں: ''وہ شخص جو گھر پہ موجود ہو''۔ ہمارے تصور میں نہیں آ سکتا اس لیے کہ ہم لوگ تو تمدنی زندگی کے رہنے والے ہیں' عام طور پہ گھر پہ ہی رہتے ہیں' کبھی کبھی باہر گئے۔ وہ جو ان لوگوں کی صحرائی زندگی تھی' وہ اکثر باہر سفر میں ہی رہتے تھے۔ اور سفر وہ صحرا کا تھا' ائر کنڈیشن کا سفر نہیں تھا۔ وہاں یہ بڑی اہم چیز تھی۔ شھد کے معنی ہوتا تھا وہ جو ''گھر پہ موجود ہو''۔ گھر پہ موجود ہونا پہلی چیز ہوگئی۔ اور غاب وہ ہے جو سفر میں ہو۔ یہ ہیں شھد اور غاب کے الفاظ اس کے بعد ہے کہ وَمَنۡ كَانَ مَرِيۡضًا (2:185) یہاں استثنا کے لیے مَرِيۡضًا کہہ دیا۔ گویا تندرست ہونا ضروری ہوگیا۔ اب اگر وہ گھر پہ نہیں ہے اور تندرست بھی نہیں ہے تو کیا کرے؟ کہا کہ وَمَنۡ كَانَ مَرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ (2:185) وہ مریض

---

[1] ساری دنیا یہی کہتی ہے۔ یہ بات ساری دنیا کہتی ہے مگر پھانسی اسے چڑھا دو۔
[2] جو مر گیا ہے اس کے لیے بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے؟

ہو یا حالتِ سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرے۔

عزیزانِ من! ٹریننگ کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مختلف Badges (گروپ) بنائے جائیں گے جو اس قسم کے، اس نارمل کورس میں شامل نہیں ہو سکیں گے، ان کے لیے پھر دوسرے مقام پہ، دوسرے وقت میں، دوسرا ٹریننگ کورس ہوگا۔ ہاں تو یہ بات ہوگئی کہ گھر پہ موجود ہو، تندرست ہو۔ اگر موجود نہ ہو، مسافر ہو، تو دوسرے دنوں میں، اور اگر مریض ہو، تو جب تندرست ہو جائے تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرلے۔

روزوں کے سلسلہ میں جناب مودودیؒ کی ایک عجیب وغریب منطق

برادرانِ عزیز! بظاہر نظر آتا ہے کہ بات مکمل ہوگئی لیکن یہ قرآن ہے، کہتا ہے کہ بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ ایک تیسری کیٹگری (شِق) بھی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ (2:184) وہ روزے کو بہ مشقت نبھا سکتا ہے۔ اس کے لیے دوسرے اوقات میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے یہ ہے کہ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (2:184) وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ یہ کون ہیں؟ یہی تھا جس کے لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے ذرا تفصیل سے بیان کرنا پڑے گا۔ میرے الفاظ میں نہ سنیے، آپ کے ہاں یہ قصہ چلا آ رہا ہے۔ پہلے دن سے جو ایک بھیڑ گئی، وہ ایک راستے سے چلی جا رہی ہے۔ میں، جو زیادہ قدامت پرست لوگ ہیں، ان کی بات نہیں پیش کر رہا، یہ ہمارے ہاں اسی لفظ کے متعلق ایک بحث چلی تھی، میں وہ پیش کر رہا ہوں۔ اتفاق سے وہ بات سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (1903-1979ء) کے ساتھ چلی تھی۔ گو یا وہ ہمارے دور کے ماڈرن قسم کے مفسر ہیں۔ میں نے اس لیے یہ عرض کیا ہے کہ یہ نہ کہا جائے کہ صاحب! وہ جو پکی روٹی کی قسم کے ملا ہیں، یہ ان کی بات کر رہا ہے۔ پہلے انہوں نے قرآن کی اس آیت کا ترجمہ کیا۔ کہا کہ یہ چند گنے چنے دن ہیں، پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو، تو ان کا شمار دوسرے دنوں میں ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے آگے وہ آیت آتی ہے، قرآن شریف سامنے ہے تو نکال لیجیے، یہ بڑی اہم بات ہے جواب آئے گی۔ وہ آیت یہ ہے کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (2:184)۔ ترجمہ سنیے کہ جو مریض ہو، مسافر ہو، تو وہ دوسرے دن میں پورا کرے اور جو لوگ اس کی یعنی روزے کی، طاقت رکھتے ہوں، ان پر ایک مسکین کے کھانے کا فدیہ ہے۔ یعنی جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں، وہ تو ایک مسکین کا فدیہ دیدیں، جو طاقت نہ رکھتے ہوں وہ ضرور روزہ رکھیں۔ مریض ہے، دوسرے دنوں میں رکھیں، مسافر ہے واپسی پہ رکھے۔ ہٹا کٹا ہے، گھر پہ بیٹھا ہے، مسافر بھی نہیں ہے، مریض بھی نہیں ہے، تندرست ہے، روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے تو کہا ہے کہ اور جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں، ان کو فدیہ ہے ایک مسکین کا۔ آپ نے غور فرمایا یا ابھی کچھ اور سمجھنے کی بات ہے؟ ہے ضرور، اس لیے کہ آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟ اور میں نے اس لیے اپنے الفاظ میں نہیں کہا، عبارت پڑھ کر سنا دی ہے۔ ان کی تفسیر موجود ہے، اسے نکال کر دیکھ لیجیے گا۔ اب نئی بات نہیں ہے،

ہزار برس سے یہ لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ہوگئی یہ بات تواتر سے ثابت ہے۔ یہ لکھنے کے بعد' اب زمانہ یہ دورِ موجودہ ہے کہ صاحب! جو پڑھے گا' وہ تو کہے گا کہ یہ کیا صاحب! کہ جو''روزہ رکھن دی طاقت رکھے تے فدیہ دے کے چھوٹ جائے' جناں نوں طاقت نہ ہووے اور روزہ رکھن ❶ ''مرے کو مارے شاہ مدار۔''میں بیمار آں اچھا جدوں تندرست ہوویں گا اوہدوں رکھیں۔ میں تے وانڈے گیا ہویاں۔ کدی تے گھر آویں گا ای نا۔ گھر بیٹھا اے چنگا بھلا تندرست طاقت رکھدا اے ہیگا' اوہنوں کہندا اے کہ اک فقیر نوں کھانا کھلا' تینوں نئیں روزہ ❷ ''۔ انہوں نے یہ لکھا۔ اس کے بعد کسی نے اعتراض کیا تو انہوں نے اس کا نام ایک نیا فتنہ رکھا۔ کہا کہ یہ پھر فتنہ ہے کہ جی! دیکھیے' یہ اعتراض کرتے ہیں۔ اس کے بعد بڑے فخر سے لکھتے ہیں کہ کسی سے کہیے کہ قرآن شریف سے اس اعتراض کا جواب دیدے۔ قرآن پہ اس طرح تنقید کرتے ہیں جیسے وہ''پرویز صاحب دی کوئی کتاب ہوندی اے ❸ ''۔ ذہن میں نہیں ہے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے جس پہ ہمارا ابھی ایمان ہے۔ مگر اعتراض یوں کریں گے کہ جیسے وہ کوئی ہماری کتاب ہے۔

عزیزانِ من! اِن سے کہیے کہ وہ اس اعتراض کا جواب قرآن سے دیں۔ اب درس کا وقت نہیں ہے ورنہ میں پڑھ کر سنا تا کہ یہ جو اس قسم کی چیزیں ہیں' اس قسم کی باتیں ہیں' وہ ایک اناڑی بھی یوں نہیں کہتا۔ یہ لکھا ہوا ہے خدا کی کتاب کے متعلق اس بات سے تو بہ بھئی! اب اس کے بعد صاحب! آگے چلیے' اب دیکھیے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآن مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اچھا جی! کیا مدد دیتی ہے؟ کہتے ہیں کہ یہ جو پہلا حصہ تھا' یہ ایک سال پہلے نازل ہوا' دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود' اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے۔ مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا۔ چل بھئی! قصہ ہوا ختم۔ کہاں ہے جی! وہ کہ دوسرے سال اسے منسوخ کر دیا؟ حدیث شریف میں جو آ گیا۔ پہلے سال روزے کو فرض کیا' فرض کرنے کے ساتھ کہہ دیا کہ جن میں روزہ رکھنے کی ہمت ہے' وہ نہ رکھیں' وہ فدیہ دیدیں۔ سال کے بعد چونکہ رمضان آتا ہے' پہلے رمضان میں تو یہ کر گئے (معاذ اللہ معاذ اللہ)' اس کے بعد پھر خود ہی اللہ میاں کو خیال پیدا ہوا کہ''اے حکم کی دے دتا؟ دوسرے سال دے روزے آن تو پہلاں پہلاں کہہ دتا ❹ ''کہ وہ حکم منسوخ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حل کیسے تلاش ہوا۔ اس بیان سے نہ صرف یہ ہوا کہ سارے اشکالات' یہ ان کی عبارت ہے' رفع ہو گئے' بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے وقت یہ بات کیوں کہہ دی۔ کیا بتائیں کہ انہوں نے قرآن کو کیا سمجھ رکھا ہے؟

---

❶ جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھے وہ فدیہ دے کر چھوٹ جائے اور جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو وہ روزہ رکھیں۔

❷ میں بیمار ہوں۔ اچھا' جب تندرست ہو جاؤ تو پھر رکھ لینا۔ جی! میں تو سفر میں ہوں۔ اچھا' کبھی تو گھر آؤ گے۔ وہ گھر بیٹھا ہے' چنگا بھلا تندرست و توانا ہے' روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اسے کہتا ہے کہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دو۔ تمہیں روزہ رکھنا نہیں ہے۔

❸ جیسے وہ پرویز صاحب کی کوئی کتاب ہوتی ہے۔ ❹ یہ کیا حکم دے دیا!!! دوسرے سال کے روزے آنے سے قبل ہی یہ حکم دے دیا۔

قرآن حکیم کو محاورۂ عرب میں تصریف آیات کے تحت ہی سمجھا جا سکتا ہے

عزیزانِ من! سنیئے' کہا کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (2:184)۔ انہوں نے کیا کیا؟ یہ کہ يُطِيْقُوْنَهٗ کا اردو زبان میں ترجمہ کرلیا کہ ''جو اس کی طاقت رکھے'' اور طاقت کے معنی ہمارے ہاں تو پتہ ہی ہے جو ہوتے ہیں۔ یہ عربی زبان میں سمجھے ہی نہیں۔ اور پھر مجھ سے لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! یہ تو زبانِ عربی کے اندر قرآن کا لفظ تھا تو کیا بات ہوگئی کہ تم اس سے کوئی نئی باتیں نکالتے ہو' کیا ان لوگوں کو عربی زبان بھی نہیں آتی تھی؟ اب میں کیا بتاؤں۔ عزیزانِ من! بات یہ نہیں ہے' زبان کا سوال نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو اسلاف میں سے کسی کے ہاں سے کوئی غلطی ہوگئی۔

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

اب اس کو جو غلطی کہنا ہے یہ سخت غلطی ہے۔ بات بنے نہ بنے' آپ یہ کہتے چلے جایئے کہ صاحب! اس کے اندر بھی بات کچھ ہوگی بات یہی ٹھیک ہے۔ کہیں ایک غلطی چل پڑی تو اتر کے ساتھ Snowball (برف گولا) بنتا چلا گیا۔ عزیزانِ من! یہ معنی میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا' میں آپ کو کہا کرتا ہوں کہ میں نے جو ''لغات القرآن'' لکھا ہے' اس میں ہر لفظ کے لیے' عربی زبان کے جو مستند لغت ہیں' ان کے حوالے دیئے ہیں۔

لغت کی بنا پر روزوں کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے احکامات کی وضاحت

عزیزانِ من! اب سنیئے' اور پھر وجد میں آجایئے۔ کہا ہے کہ جو گھر پہ موجود ہو' تندرست ہو' اس کے لیے روزے فرض ہیں' مریض ہو جب تندرستی آجائے' صحت یاب ہوجائے' تو روزے فرض ہیں۔ مرض ایک عارضہ ہوتا ہے پھر آدمی تندرست ہوجاتا ہے' سفر ایک عارضی چیز ہے پھر گھر پہ آجاتا ہے۔ ایک شخص بوڑھا ہو چکا ہے' بڑھاپے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی اس میں طاقت نہیں' وہ اس کو بہ مشقت کر سکتا ہے' یہ نہ مسافر ہے' نہ مریض ہے۔ بعض لوگ Constitutionally (جسمانی طور پر) اس قدر کمزور پیدا ہوتے ہیں کہ وہ تھوڑے سے وقت کے لیے بھی بھوک اور پیاس برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ یہ نہ مریض ہوتا ہے' نہ مسافر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا کام اس قدر مشقت کا ہوتا ہے جیسے جیل خانے کے قیدی' دودھ پلانے والی عورتیں' حاملہ عورتیں' بڑھاپا۔ یہ ایک کیٹیگری (شق) ہے جو نہ مریضوں میں آتی ہے' نہ مسافروں میں آتی ہے۔ برادرانِ عزیز! عربی زبان میں یطیق کہتے ہیں ''جو کام بہ مشقت کیا جاسکے''۔ اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یہ طوق (ط و ق) سے ہے جو طاق ہے' جیسا کسی کے گلے میں طوق پڑ گیا ہو۔ یہ ہے جو کام کوئی بہ مشقت کرے یعنی جس میں اس کے کرنے کی طاقت نہ ہو لیکن بڑی مجبوری سے کوئی کام کرے۔ یہ تیسری کیٹیگری (شق) ہے۔ کہا ہے کہ اگر تندرست گھر پہ موجود ہے تو روزہ رکھے' مریض ہے مرض کے بعد رکھے' مسافر ہے واپسی پر رکھے۔ اور وہ شخص جس میں اب روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رہی ہے' اتنا بوڑھا ہو چکا

ہے کہ ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے' وہ نہ اس وقت رکھ سکتا ہے نہ اسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگلے سال رکھنا۔ ستر برس کے بوڑھے سے یہ کہنا کہ ''اچھا ایدکیں نہ رکھ' جدوں اکہتر اں دا ہوجائیں گا اوہدوں رکھیں [1]''۔

کیا بات ہے قرآن کی! کہا ہے کہ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (2:184)۔ دل سے تو اس جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے' رمضان بھر میں یہ چیز کرے۔ اس کے اندر یہ کیفیت ہوگی کہ باقی دنوں سے کچھ دوسرے دن آئے ہوئے ہیں' احساس ہوگا کہ مجھ میں ہمت نہیں' کوئی استعداد نہیں' میں نہیں رکھ سکتا' میری طرف سے ایک سپاہی کا جو خرچ ہے وہ میں بھیجتا چلا جاتا ہوں اس طرح یہ کرلیا کہ ایک مسکین کو کھانا کھلاؤ۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (2:184)۔ عزیزانِ من! آپ نے حکم کی جامعیت دیکھی! کیا اب اس کے بعد بھی کوئی کیٹگری (شِق) باقی رہ گئی ہے؟ اب میں نے یہ کہا ہے کہ یہ میرا ترجمہ نہیں ہے۔ عربی زبان کے مستند لغت سے ہے۔ عربی لغت میں محیط المحیط [2] ایک مستند لغت ہے۔ اول تو آپ میر الغات القرآن دیکھیں گے اس میں سارے حوالے آجائیں گے۔ محیط المحیط نہایت مستند لغت ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ طاقت کے معنی ''کسی چیز پر قدرت رکھنا ہے لیکن یہ ایسی قدرت کا نام ہے جسے انسان بہ مشقت کرسکے''۔ دراصل یہ اس طوق کے ساتھ تشبیہ ہے جو کسی کے گلے میں ڈال دیا جائے۔

حقیقی مفہوم کے برعکس اپنی علمی کم مائیگی کی بنا پر ہمارے ہاں کیے گئے تراجم کی نوعیت

عزیزانِ من! اس میں اس نے ایک بڑی چیز کہی ہے۔ قرآن میں وہ جو دعا سکھائی گئی ہے کہ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ (2:286)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''جن چیزوں کی ہمیں طاقت نہ ہو' ہم پہ وہ بوجھ نہ ڈال دینا''۔ یعنی اللہ میاں کو یہ سمجھانے جارہے ہیں کہ حکم جو دے رہے ہو' دیکھنا! دس سال کا بچہ ہے' اس کے سر پہ دو من بوجھ نہ رکھ دینا۔ یعنی اللہ میاں کو سکھا رہے ہیں کہ ایسی بات کا ہمیں حکم نہ دینا جس کی ہمیں طاقت نہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ''جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو' وہ ہم بہ مشقت کرسکیں جس کے ہم متحمل نہ ہوسکیں''۔ تاج العروس [3] عربی زبان کا بڑا مستند لغت ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ الطاقة اس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام کرنا کسی انسان کے لیے بہ مشقت ممکن ہو' وہ کام اس پر اتنا شاق گزرے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو۔ مصر کے مشہور مفتی (علامہ محمد) عبدہ (1906-1849ء) نے اپنی ''تفسیر المنار'' میں یہ چیز لکھی ہے کہ ''عرب أطاق الشيئ صرف اس وقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اس کی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا متحمل ہونا پڑے' جب اس کی قوت انتہائی دشواری کے ساتھ' اس کو برداشت کرسکے چنانچہ الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ سے مراد بوڑھے ضعیف اپاہج لوگ ہیں' جن کی بیماریوں کے اچھا ہونے کی اُمید نہ ہو۔ وہ لوگ بھی جوان کے مثل ہیں مثلاً وہ کام کرنے والے' جن کی معاش پر مشقت کام

---

[1] اچھا! اس سال نہ رکھو' جب 71 سال کے ہوجاؤ گے تو رکھ لینا۔ [2] یہ پطرس بستانی کی تالیف ہے۔ یوں تو یہ کتاب مختصر ہے لیکن اس کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہے۔ [3] یہ محب الدین' ابن الفیض' السید محمد مرتضیٰ الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی (م 1205ھ / 1791ء) کی تالیف ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے یہ لغت بڑا سائنٹیفک ہے۔

میں رکھی ہے‘ ان کو مسلسل کام ہی یہ مزدوروں کا سا کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے دنوں میں اگر کہیں گے تو یہ کام نہیں کرسکیں گے۔ اسی بنا پر امام راغب ❶ نے اپنے مفردات میں کہا ہے کہ الطاقۃ اس قوت کا نام ہے جس سے کسی کام کا کرنا‘ کسی انسان کے لیے بہ مشقت ممکن ہو۔ کشاف ❷ میں اس کی تاکید کی ہے‘ روح المعانی ❸ میں آلوسی نے اس کی تاکید کی ہے۔ قرطبی ❹ کی ایک تفسیر القرآن ہے اس کے اندر اس نے اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کی تفسیر لکھی ہے کہ اس سے مراد بوڑھے مرد‘ بوڑھی عورتیں ہے۔ اس کے بعد تاج (العروس)‘ محیط (المحیط) اور راغب (اصفہانی) کی مشہور تصنیف ’’المفردات فی غریب القرآن‘‘ نے لکھا ہے کہ یہ بھی اس کیٹگری (شِق) میں آسکتے ہیں‘ یہ بھی آسکتی ہیں۔ یہ جو کیٹگریز (شقیں) ہیں وہ آپ اپنے ہاں خود تجویز کرسکتے ہیں۔

روزہ نہ رکھ سکنے کی صورت میں فدیہ دینے کی کیفیت اور نوعیت

برادرانِ عزیز! اصولی بات یہ ہوگئی کہ جو اسے بہ مشقت کرسکیں‘ طاقت نہ رکھتے ہوں‘ اردو زبان میں ہم یہ کہیں گے‘ ان کے لیے فدیہ ایک مسکین کا ایک کھانے کا ہے۔ ایک کے کھانا کھلانے کا کہنے کے بعد کہا کہ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ (2:184) او بھئی! کم از کم یہ ایک تو ہم نے کہہ دیا ہے‘ اگر اپنے دل کی مرضی سے اس سے زیادہ کرو گے‘ تو زیادہ اچھا ہے۔ اب آگے بارڈر لائن کیس ہے جس کے لیے کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کرسکتا کہ واقعی میں یہ بہ مشقت رکھ سکتا ہوں یا میں رکھ سکتا ہوں‘ اس رکھ سکتا ہوں کے لیے کہا کہ اس بارڈر لائن کیس کے اندر یہ یاد رکھو کہ اگر دونوں طرف بین بین کی بات ہو تو وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (2:184) اس صورت میں اگر روزہ رکھو‘ تو زیادہ بہتر ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (2:184) اگر تم بات سمجھو تو یہ سمجھ جاؤ گے کہ بارڈر لائن کیسز کے اندر جہاں رکھ نہیں سکتے‘ ذرا سی برداشت کرنا پڑتی ہے‘ یہ ٹھیک ہے ہماری طرف سے اجازت تو ہے کہ تم فدیہ دے سکتے ہو لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر تم روزہ رکھ سکو تو وہ زیادہ بہتر ہے۔

❀❀❀❀❀

---

❶ امام راغب اصفہانی (م۔502ھ) کی یہ مشہور تصنیف ’’المفردات فی غریب القرآن‘‘ ہے۔
❷ زمخشری کی تفسیر کشاف ہے۔ ❸ روح المعانی آلوسی کی تفسیر ہے۔ ❹ قرطبی کی تفسیر القرآن ہے۔

سانحہ اِرتحال

محترم ریاض صاحب بزمِ طلوعِ اسلام لندن، یوکے۔ کے ابتدائی رُکن ہیں اور فکرِ قرآنی کے قدیمی مبلغین میں سے ہیں۔ گذشتہ دنوں اُن کی اہلیہ محترمہ مختصر علالت کے بعد وفات پا گئی ہیں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور اعزہ واقرباء کو صبرِ جمیل کی توفیق سے نوازے۔ ادارہ ریاض صاحب اور ان کے صاحب زادے شاہ ریاض صاحب اور دیگر بچوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ڈاکٹر علی نصیر عباسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشکیل معاشرہ اور قرآنی کردار

جدید سائنس کے انکشافات

یہ سنہ 2002ء اور مارچ کی 31 تاریخ ہے‘ 23 مارچ کی یاد میں لگتا ہے کہ ہم سب یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ سب کو مبارک باد ہو اور آپ سب پر سلام و رحمت ہو کہ ایک اچھے مقصد کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں ورنہ بقول علامہ اسلم جیراجپوری مسلمانوں کا اجماع واتحاد (موجودہ تاریخ) میں اکثر باطل پر ہی ہوا ہے۔ اس تقریب سعید پر میں تمام احباب‘ جو یہاں موجود ہیں اور انتظامیہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر کی خدمت میں بھی دلی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ جناب محترم اقبال صاحب اور ان کی ٹیم قابل تعریف ہیں کہ یہ کام محنت طلب ہیں اور ان میں کافی ٹائم اور دوسرے Resources بھی لگتے ہیں۔ اس قسم کے اجتماعات میں مجھے سائنسی تحقیق آپ کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے تا کہ آپ کی زندگیاں سنور جائیں اور یہ ثابت ہو کہ ’’قرآن حق ہے اور باقی سب افسانے یا وہم وگمان و قیاس‘‘۔ ارشاد قرآنی ہے کہ ’’ہم انہیں انفس و آفاق میں نشانیاں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن فی الواقع حقیقت ثابتہ ہے۔‘‘ (41:53) میرا طریقۂ کار یہی رہا ہے اور اس آیت میں میرا شعبہ یا موضوع ’’عالم انفس‘‘ یعنی نفس انسانی کے معاملات ہیں یعنی Psychology اور Psychiatry وغیرہ۔ ڈاکٹر سید عبدالودود ’’عالم آفاق‘‘ سے بحث کرتے تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت دے۔ ایسے انسان اور عالم شاید ہی مسلمانوں میں پیدا ہوں۔ آج کی اس بامقصد محفل میں ایسے ہی معاملات سیکھیں گے۔ تا کہ ہمارے دل و دماغ بدل جائیں اور ہماری زندگی اعلیٰ بن سکے۔ اگر ہماری محفلیں بے مقصد ہیں‘ یعنی ہم ان میں کچھ اعلیٰ وارفع نہیں سیکھتے ہیں تا کہ عملی زندگی بہتر ہو تو ایسی محفلوں کا منعقد کرنا وقت کا اور زندگی کا زیاں اور محض فرار زندگی یعنی Escapism کی قسم ہے۔ اس لئے آپ سے تھوڑی سی محنت چاہوں گا۔ یعنی آپ کو تھوڑی Effort کوشش کر کے گہری توجہ قائم رکھنی ہوگی۔ قرآن حکیم اور علم نفسیات کا قانون مسلمہ ہے کہ ’’بغیر محنت و جدوجہد کے کچھ بھی

> میری اپیل آپ کی ’’عقل‘‘ یا ’’Reasoning Faculty‘‘ سے ہے جذبات سے نہیں۔ آپ میں اگر منفی ردعمل پیدا ہو‘ تو ’’علم‘‘ حاصل کرنے اور سیکھنے کے ردعمل کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔ نا کہ جذباتی ردعمل وغیرہ۔ ورنہ آپ کچھ بھی سیکھ نہیں سکیں گے

حاصل نہیں ہوگا''۔ ہمارا موضوع کچھ ایسا ہی ہے۔اس کے علاوہ ایک ضروری ہدایت جونفسیاتی نوعیت کی ہے کہ میرے لیکچر کا تعلق بڑے نازک گوشوں سے ہے' اس میں عین ممکن ہے کہ آپ کے دل و دماغ میں منفی جذبات و احساسات شعوری و لاشعوری طور پر پیدا ہوں۔تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ وہ آپ کا ذاتی ردعمل (Psychosocial Response) ہے۔میرا مقصد آپ کے جذبات کی توہین نہیں ہے۔اگر آپ کو یہ محسوس ہوتو یہ آپ کا ذاتی جذباتی ردعمل ہے۔آپ کی دل آزاری میرا مقصد نہیں' ہو سکتا ہے میری اپیل آپ کی ''عقل'' یا ''Reasoning Faculty'' سے ہے جذبات سے نہیں۔آپ میں اگر منفی ردعمل پیدا ہو' تو ''علم'' حاصل کرنے اور سیکھنے کے ردعمل کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔نا کہ جذباتی ردعمل وغیرہ۔ورنہ آپ کچھ بھی سیکھ نہیں سکیں گے۔

قرآن حکیم کا سارا زور ہی کردار پر ہے یعنی "Character Is Destiny"۔قومی معاملہ ہو یا معاشرتی یا شخصی (Individual/Personal) ہو' یہ ہی قانون ہے۔یعنی تشکیل کردار یا کیریکٹر سازی کے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہوں گے چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔کراچی کے Defence میں رہ لیں یا امریکہ چلے جائیں یا چاند پر چلے جائیں کچھ بھی نہیں ہوگا

ہمارا موضوع ہے تشکیل معاشرہ (پاکستان اس میں شامل ہے) کے لئے قرآنی کردار کی تشکیل۔لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'پاکستانی معاشرہ' کے لئے یا کسی اور معاشرہ کے لئے بھی ''قرآنی کردار'' کی ضرورت؟ لیکن کیوں؟ اس سے کیا فائدہ؟ اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان ہوگا؟ اس طرح کے زندگی کے اہم ترین مسائل پر تو تحقیق سب سے زیادہ مسلمان ممالک میں ہونی چاہئے تھی۔ بہرحال کس کس بات پر روئیں اور ہمارا تحقیق سے کیا واسطہ؟ مفکر عظیم جناب پرویز صاحب نے ایک بار بڑے دکھ سے اور الم انگیز انداز میں ٹھیک کہا تھا کہ ''پاکستان میں ''علم'' جنس کا سد سمجھا جاتا ہے''۔

میں شروع ہی سے اپنا نکتۂ نظر بتا دینا چاہتا ہوں کہ چاہے وہ پاکستان کی تشکیل ہو یا کسی بھی معاشرہ کی تعمیر و بقا' اس کا دارومدار ''کردار'' یا ''کیریکٹر'' پر ہی ہے اور ہمیشہ یہی قانون رہا ہے اور رہے گا۔ ماضیٔ قریب میں (1947) آزادیٔ و تشکیل ملک پاکستان کی وجہ بھی ''کردار'' تھا اور مزید ترقی و بقا بھی ''قرآنی کردار'' کے ذریعے ہی سے ہوگی ورنہ نہیں۔

میں یہی حقیقت جدید سائنس کی تحقیقات سے ثابت کرنا چاہوں گا۔قرآن حکیم کا سارا زور ہی کردار پر ہے یعنی "Character Is Destiny"۔قومی معاملہ ہو یا معاشرتی یا شخصی (Individual/Personal) ہو' یہ ہی قانون ہے۔یعنی تشکیل کردار یا کیریکٹر سازی کے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہوں گے چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔کراچی کے Defence میں رہ لیں یا امریکہ چلے جائیں یا چاند پر چلے جائیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔آیئے مزید تفصیل سے سمجھیں یعنی سائنس کی بارگاہ میں چلتے ہیں۔

اس علم کو یا Study کو عام طور پر نفسیات میں "Characterology" کہا جاتا ہے۔یہ اب تو ایک باقاعدہ

شعبۂ علم بن چکا ہے۔ اب اس کے بڑے بڑے ماہرین تحقیق و تجربات سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں خاص طور پر معاشرتی اور تنظیمی معاملات میں تشکیل کردار یعنی لیڈروں کا کردار ''اعلیٰ'' ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سب کچھ بے کار ہے۔ ساری کوششیں جو صدیوں سے ہو رہی ہیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

> جس وقت ہمارے منتخب قومی نمائندے یا نیشنل لیڈر اقتدار ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اسی لمحے ان کے کردار کا بیج قوم کی تقدیر بن جاتا ہے' قوم کی منزل مقصود اسی کردار کے مطابق طے پاتی ہے۔ قوم کی تقدیر لیڈروں کے کردار پر منحصر ہوتی ہے

ابھی' ایک ریسرچر Sheehy نے تشکیل معاشرہ اور کردار سے متعلق 25 سالہ تحقیق کا نام ہی "Character" رکھا ہے۔ جس کی ابتداء ہی کچھ یوں ہے۔ ''اگر آپ عمل کا بیج بوئیں گے تو عادت کا پھل کاٹیں گے۔ پھر اگر عادت کا بیج بوئیں گے تو کردار یعنی کیریکٹر کا پھل کاٹیں گے اور پھر اگر کردار کا بیج بوئیں گے تو ہمیں ہماری منزل مقصود مل جائے گی'' اصل الفاظ یوں ہیں۔

"Sow an act, and you reap a habit, Sow a habit and you reap a character, Sow a character and you reap a destiny."

اس قانون کو سامنے رکھتے ہوئے وہ اپنے نتائج پیش کرتی ہیں جو غور طلب ہیں مفہوم ہے کہ ''اور جیسے ہی' جس وقت ہمارے منتخب قومی نمائندے یا نیشنل لیڈر اقتدار ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اسی لمحے ان کے کردار کا بیج قوم کی تقدیر بن جاتا ہے' قوم کی منزل مقصود اسی کردار کے مطابق طے پاتی ہے۔ قوم کی تقدیر لیڈروں کے کردار پر منحصر ہوتی ہے وغیرہ۔''

"By the time they become national leaders, the candidate's character are sown... the destiny they reap will be our own".

اور آپ حضرات متوجہ ہوں کہ معاملہ غور طلب آ رہا ہے کہ

"Finally, examining how character is formed in our national leaders, is an effective way to learn about our selves."

یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ قرآنی آیت کا ترجمہ ہو کہ' جیسے ہم خود ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے لیڈر ''یا'' جیسے لیڈر ویسی ہی قوم' .... یہ ہے پیمانہ۔

ان مسائل پر گہری اور Objective Research معروضی تحقیق کرنے والے اب بھی مغرب میں بہت کم ہیں۔ تحقیق تو وہ ہی کرتے ہیں اور ان کا یہ احسان عظیم انسانیت پر ہے۔ بہر حال ان حالات میں بڑے انتظار اور مسلسل تحقیق کے بعد ہی ایسی اعلیٰ درجے کی علمی و عملی تحقیق سامنے آتی ہیں۔ جن عظیم علماء یا مفکرین نے ان معاملات کی گہری اور وسیع ریسرچ کی' ان میں ممفورڈ کا نام بہت اونچا ہے۔ بڑا عظیم عالم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر ہم پورے کردار یا ساری شخصیت کو نہیں سنواریں گے تو ہم فیل ہوتے جائیں گے۔ جیسے کہ پچھلے پانچ سو سال کی تاریخ میں ہوا۔ معاشرتی و معاشی و سیاسی لحاظ

سے بیرونی طور پر ہم کچھ بھی کر لیں اگر ہم نے متوازن کردار یا Balanced Personality تعمیر نہیں کی تو ہماری تہذیب تنزل کی طرف گرتی چلی جائے گی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے' تو ضرورت مکمل نشوونما یافتہ ذات یا کردار انسانی کی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

ڈاکٹر فرام (Fromm) جنہیں شاید نوبل انعام ملنا چاہئے تھا' لیکن مغرب کی غیر منصفانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے گوارا نہ کیا۔ جو ایک عظیم نفسیاتی ماہر و معاشرتی علوم کے بلند ترین عالم ہیں۔ ان کی ساری زندگی اسی پیچیدہ ترین موضوع کی تحقیق میں گزری اور ان کی ہر کتاب تقریباً اسی معاملے کی تفسیر ہے۔ خاص طور پر ان کی کتابیں۔

"To Have or To Be", "The Anatomy of Human Destructiveness", The Sane Society".

بڑی ہی قابل قدر خدمات ہیں نوع انسانی کی۔ وہ ان نتائج پر پہنچا ہے کہ تشکیل معاشرہ کے لئے اعلیٰ کردار ضروری اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن ہی نہیں اور ایسا کرنا تو کیا۔ ایسا سوچنا بھی غلط ہے اس کے برعکس سوچ Abnormal Mind یا Destructive Character کی علامت قرار دی جاتی ہے وغیرہ۔ اس کا کہنا ہے کہ اعلیٰ کردار "Loving یا "Being Mode" Character یا (Productive-Creative) Character" کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن نہیں۔ مثلاً "The Anatomy of Human Destructiveness" میں جو ایک Pioneering Research.... ہے اور آج تک یعنی سنہ 2002ء تک' اس کے پائے کی تحقیق نظر نہیں آتی۔ ساری کتاب میں صاف بتایا گیا ہے کہ برے یا منفی کردار یعنی Destructive Character کے لوگوں یعنی لیڈروں کے آنے سے قوموں کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور دنیا کس دردناک عذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کی طرح کے حادثات اور ان سے پیدا ہونے والی تباہیاں اسی کا نتیجہ ہیں مثلاً Hitler (ہٹلر) اور Stalin (سٹالن) وغیرہ کے کردار کا نتیجہ انسانیت اب تک بھگت رہی ہے۔

برے یا منفی کردار یعنی Destructive Character کے لوگوں یعنی لیڈروں کے آنے سے قوموں کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور دنیا کس دردناک عذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کی طرح کے حادثات اور ان سے پیدا ہونے والی تباہیاں اسی کا نتیجہ ہیں

لینن (Lenin) کی ساری زندگی کی جدوجہد کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے دیکھئے!

لینن کی عظیم جدوجہد سے روس آزاد ہوا اور ایک معاشرتی تجربہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ لینن کردار یعنی کیریکٹر کا قائل نہیں تھا۔ لیکن زندگی کے آخری وقت میں اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا۔ جب کہ (Stalin) سٹالن کو اقتدار دیا جا رہا تھا۔ تو اس نے وصیت کی کہ ایسا نہ کریں۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ روسی قوم نے Stalin کے کیریکٹر یا

کردار کا بیج بویا اور وہ دیکھو! آپ کے سامنے روسی قوم کا نظام تباہ ہو گیا۔ صدیوں کی محنت اور عظیم قربانیاں بے کار ہو گئیں۔ آج اس تجربہ کے نتیجے' عبرت کے لئے باقی ہیں۔ ساری انسانیت کے لئے یہ رک کر سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ اس طرح کے جذباتی فیصلوں کا انجام ایسا ہی ہوگا۔

فرام کی آخری عظیم تحقیق "To Have or To Be" تو نام سے ہی ظاہر ہے۔ اس میں بھی وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اعلیٰ انسانی معاشرہ "Good Society" صرف اور صرف اعلیٰ انسانی کردار کا ہی نتیجہ ہے۔ اور برا یا ''انسانیت کش معاشرہ'' انسانیت کش کردار سے پیدا ہوتا ہے۔ جسے وہ "Having Mode" کہتا ہے۔ "Having Mode" کا تجربہ تو ہمیں ہر پل ہو رہا ہے۔ اس کے تجربے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ساری دنیا اسی کردار کے نتائج بھگت رہی ہے۔

1997ء میں ڈاکٹر Bennis نے اپنی ساری زندگی کی تحقیق پیش کی ہے۔ اس کا بین الاقوامی مقام ہے اور لیڈر شپ اور "Organizations" کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بینس کے نتائج بھی غور طلب ہیں نوع انسانی کے لئے۔ سنئے دل کے کانوں سے۔

''ہماری کامیابی و ناکامی کا دارومدار ہر طرح کی تنظیم میں (چھوٹی تنظیم سے قومی تنظیم تک) تنظیموں کی اوپری سطح کے کردار کی نوعیت و معیار (Quality) پر مبنی ہے۔''

"The Success and failure of all organization, rests on the percieved quality at the top."

اور یہ کہ ''ہم لیڈروں کے بغیر چل نہیں سکتے' کوئی کام ہی نہیں کر سکتے ہیں۔ ہماری زندگی کا دارومدار لیڈروں کے کردار کی نوعیت و معیار پر مبنی ہے''۔

"We can not function with out leaders. Our quality of life depends on the quality of our Leaders."

یعنی پھر قرآنی آیات کا مفہوم ہے کہ جیسے ہم ویسے لیڈر یا جیسے ہمارے لیڈر ہوں گے ویسی ہی قوم۔ آگے سنئے یہ سائنس دان کیا کہتا ہے:

''250 ملین امریکیوں کی زندگی کا دارومدار ہی لیڈر شپ پر ہے۔ ہمارا سارا کلچر یا سسٹم بحران زدہ ہے اور یہ بحران بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ اپنا راستہ بھول چکا ہے۔ نشے کی لت کے معاملے میں ہم نمبر 1 (ایک) قوم ہیں۔ سارا معاشرہ' تمام تنظیمیں اور ادارے Institutions بحران میں ہیں۔ کیونکہ ہماری لیڈر شپ کا کردار یا کیریکٹر گر چکا ہے۔ یعنی ہمارے امراض کی تشخیص دراصل لیڈر شپ کا بحران ہے۔ جس سے سارے کے سارے مسائل ابھرتے ہیں۔ جب لیڈر شپ کا معیار (Quality) گرے گا مسائل حیات بڑھ جائیں گے۔ جس طرح انسان بغیر دماغ کے کام ہی نہیں کر سکتا

ہے، اسی طرح سے معاشرہ لیڈروں کے بغیر چل نہیں سکتا ہے اور اس طرح سے تنزل و تباہی جاری رہے گی۔ جب تک لیڈروں کے کردار ٹھیک نہیں کریں گے ہم بحران زدہ اور تباہ ہوتے جائیں گے۔ یعنی پہلا کرنے کا کام اعلیٰ کردار کے لیڈر بنانا ہے اور پھر معاشرتی نظام بلند ہو سکے گا۔''

لیکن سوال یہ ہے کہ لیڈر شپ ہے کیا بلا؟ ڈاکٹر بنیس کا یہ جواب انتہائی غور طلب ہے۔ سنئے! وہ کہتا ہے۔

''لیڈرشپ اعلیٰ کردار کا دوسرا نام ہے۔ (Leadership is Character) یا دوسرے الفاظ میں یہ "Integrated Adult" کو کہتے ہیں۔ (نشوونما یافتہ ذات) اور مزید سمجھا تا ہے کہ 'اس کے معانی ہیں کہ 'بحیثیت انسان 'ہم' کیا ہیں؟''

(Who we are as Human Being?) اور لیڈر کی تشکیل کا عملی طریقہ (process) وہی ہے جو اعلیٰ درجہ کا انسان بننے کا طریقہ ہے۔''

ڈاکٹر فرام اپنی عظیم کتاب "The Art of Loving" میں اس امر کی وضاحت کتاب کے آخری باب میں یوں کرتے ہیں کہ ''اگر اعلیٰ کیریکٹر کی خصوصیات عملی طور پر ہماری قوم کی زندگی میں مسلسل و متواتر منتقل نہیں ہوں گی تو کچھ بھی کر لیں، ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب نیست و نابود ہو جائے گی۔''

ابراہیم میسلو (Maslow) کا شمار بھی دنیا کے عظیم مفکرین اور نفسیات کے سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ وہ بھی عبرت انگیز و پر از نصیحت نتائج پر پہنچتا ہے کہ ''اعلیٰ سوسائٹی کے ساتھ اعلیٰ کردار شرط اولین ہے اگر اعلیٰ کردار سازی پر معاشرہ نے توجہ نہیں دی تو ہمارا وجود مٹ جائے گا۔''

آپ نے دیکھا کہ کہاں پہنچ گئے ہیں یہ علماء یا سائنسدان اور مفکر؟ دیکھئے اور غور کیجئے کہ قرآن کی آواز کہاں سے ابھر رہی ہے۔ کیا قرآن حکیم نے سچ نہیں کہا کہ ''ہم انہیں عالم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تاکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن فی الواقع حقیقتِ ثابتہ ہے''۔

پھر عرض کروں گا کہ کوئی بھی کام ہو، کوئی بھی انسانی زندگی کا معاملہ ہو اس میں کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر ایک قدم بھی ترقی ممکن نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہی قانون حق ہے۔ موجودہ مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم قومیں، اور ہماری تباہی و بربادی و بحران کے معاملے، جس کے ہم عین گواہ ہیں ان سب معاملات کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے۔ یعنی لیڈرشپ کا معیار اعلیٰ نہیں ہے۔ یعنی قرآنی کردار کی کمی یا نہ ہونا ہے اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دنیائے علم جدیدہ کے یہ ماہرین جو تفصیل اس کردار کی بتاتے ہیں کہ جس کے بغیر بات بنتی نہیں ہے، تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے اور بات ہے بھی باعث رشک کہ وہ قالب یا "Pattern" یا "Design" بھی قرآنی کردار کی (غیر مکمل) سی تفصیل ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ آج متمدن دنیا اپنی تحقیق سے اس مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کر

رہی ہے جس کا انکار وہ عملی طور پر صدیوں سے کرتی چلی آئی ہیں۔ نامور مفکر ڈاکٹر طہٰ حسین مصری جو مشرق و مغرب کا گہرا تجزیہ و مطالعہ رکھتے ہیں اور اسلامی تہذیب کے بڑے عالم ہیں۔ اپنی تحقیق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے:

''میرا خیال ہے کہ دنیا کی متمدن قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جس مقام پر فاروق اعظمؓ (حضرت عمرؓ) اس زمانے میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ متمدن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کیے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔'' (الفتنۃ الکبریٰ)۔

یورپ اور امریکہ کی تاریخ میں وہ دن سیاہ ترین دن تھا' جب ان کی درسگاہوں سے یہ اعلان کیا گیا کہ قرآن یا اسلام بھی دوسرے مذاہب عالم کی طرح ایک مذہب یعنی محض "Religion" ہے اور مذہب کو تو وہ تیاگ چکے تھے۔ قرآن حکیم کو بھی وہ عین اس مقام پر لے آئے۔ دنیا کے تمام مذاہب تو مغرب کے علماء کے نزدیک افسانے بن کر رہ گئے تھے جو حقائق کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے اور دنیا نے مغرب کے دوسرے مذاہب کے خلاف جو ردعمل اختیار کیا' اس کی شدت میں بغیر تحقیق کیے یہ جذباتی فیصلہ عام طور پر نافذ کر دیا جس کے نتائج یہ نکلے کہ وہ قرآنی حقائق کی طرف سے اندھے اور بہرے ہو گئے۔ اس گناہ عظیم کے بعد کس طرح پھر حقائق قرآنی ان کے سامنے آ سکتے تھے۔ مزید یہ کہ ہمارے موجودہ کردار نے بھی تو انہیں روک رکھا ہے کہ ایسے ہوتے ہیں مسلمان جیسے ہم ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم دوگنے عذاب میں مبتلا ہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

اب ہم آتے ہیں تشکیل پاکستان کی طرف' کہ اس کا کردار سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟ ہم وقت کی کمی اور دوسرے محرکات کی وجہ سے اختصار سے کام لیں گے۔

انیسویں صدی کا آغاز ہو چکا تھا سلطنت مغلیہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی اس برصغیر کے مسلمانوں کی داستان زوال' مایوسی اور شکست کے ان مراحل سے گزر رہی تھی جن کا انجام حسرت ناک موت کے سوا اور کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مسلمانان ہند کے زوال و شکست کی یہ تاریک رات عہد رفتہ میں صدیوں تک پھیلی ہوئی تھی کہ 1857ء کی بغاوت ہند' شدت جذبات کی آخری کڑی ثابت ہوئی۔ یہ جرات مسلمانوں کو بڑی ہی مہنگی پڑی اور انگریزوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کی اور یہ دونوں مظلوم و نہتے مسلمانوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ آتش انتقام سے محکومی و محرومی و مظلومی' غربت و افلاس' بے بسی اور بے چارگی کے بھیانک سائے چاروں اطراف سے مسلمانان ہند کو گھیر چلے تھے۔ مسلمانوں کی زندگی گویا کہ ایک قبرستان سی بن گئی تھی۔ چاروں طرف حسرت و مایوسی اور شکست کی نوحہ خوانیاں بپا تھیں اور نظر آتا تھا کہ یہ قوم اب گری یا اب۔ جیسے کہ موت کا انتظار ہو۔ یہ دم توڑتی ہوئی قوم عالم سکرات میں ایک بار پھر نشاۃ ثانیہ اختیار کر سکے گی' زندہ ہو سکے گی' ممکن ہی نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی معجزہ ہی ایسا کر سکتا تھا۔ یہ معجزہ ہوا۔ وہ معماران پاکستان کے کردار Character کا معجزہ تھا۔ ان کے عظیم کیریکٹر نے پھر سے ہمیں دنیا کی آزاد قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

تاریخ بتارہی ہے کہ قومی زندگی کے نازک ترین موڑ پر اگر ہمیں ان عظیم وجلیل راہ نماؤں کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو آج ہم اغیار کی غلامی اور محکومی میں مزید تباہ و برباد ہورہے ہوتے جیسا کہ پچھلے پچاس سالوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اور موجودہ ہندومسلم فسادات میں جو حالت زار مسلمانوں کی ہے وہ آج آپ کے سامنے ہے۔ ان حالات کی صرف ہلکی سی جھلکیاں آپ کے سامنے آتی ہیں۔ باقی حقائق ظلم وستم کے بارے میں پروپیگنڈا (Propaganda) اور دوسرے طریقوں کی وجہ سے سامنے نہیں آسکتے ہیں۔

ہماری نشاۃِ ثانیہ کی داستان سرسیدؒ سے شروع ہوئی اور اقبالؒ سے ہوتی ہوئی عظیم رہنما جناحؒ پر ختم ہوئی ہے۔ یہ جیت اور تشکیل معاشرہ ان تینوں کے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ہوئی۔ مسلمان تو کیا غیر مسلم بھی ان کے کردار کے قائل ہیں۔ میں ان تینوں میں سے صرف آخری کڑی محترم جناح کے کردار کے متعلق بہت مختصر سی بحث کروں گا۔ ویسے تو ان تینوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تھوڑا سا کہتا چلوں مثلاً علامہ اقبال جو بظاہر ہمیں لگتا ہے کہ بس محض ایک شاعر و فلسفی سے ہی تھے۔ لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ساری زندگی انہوں نے مسلمانانِ ہند اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کردی۔ ان کے لئے ایک تجزیہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ اپنی صلاحیتیں کہیں اور لگاتے، وہ اتنی تھیں کہ ''فورڈ'' وغیرہ سے بھی آگے ہوتے دولت و دنیاوی معاملات میں۔

ہم بات قائداعظمؒ کی کررہے تھے۔ سرسید و اقبال کی جدوجہد شاید بے کار چلی جاتیں اگر جناح ان کی کی ہوئی محنت کو ساحل مراد تک نہ پہنچاتے۔ عظیم انسان ومفکر پرویز صاحب سے بڑا گواہ اور کون ہوگا۔ انتہائی مستند گواہ۔ وہ جائزہ لیتے ہیں کہ ''جناح نے پورے دور میں ایک لمحہ کے لئے بھی جذباتی رجحان کی دلفریبیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ہندو قوم تعلیم و ترقی اور فکر و شعور کی سنجیدگی میں مسلمانوں سے کس قدر آگے تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی گاندھی جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کو اپنی لیڈرشپ کا سکہ جمانے کے لئے مہاتمائی روپ دھارنا پڑا اور وہی انداز اختیار کرنے پڑے جو ہندو کے جذبات کو اپیل کر سکیں۔ لیکن کیا حیرت انگیز ہے سیاسیات ہند کی تصویر کا دوسرا رخ کہ جناح مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور انہوں نے قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس قسم کا کوئی ادنیٰ کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اس قسم کی دلفریب نمائشوں سے کلیتہً اجتناب کیا۔ یہی جناح کی عظمت کا وہ امتیازی نشان ہے جسے ہم ان کے کمالات میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی تھا ہماری فتح عظیم کا وہ حقیقی راز جو حصول پاکستان کا حقیقی امین قرار پائے گا۔'' اور ''پھر اقبال کے خطاب الٰہ آباد کے ٹھیک دس سال بعد جناح 1940ء میں قراردادِ پاکستان کو لے کر میدان میں آچکے تھے اور یہ جدوجہد 1947ء میں حصول پاکستان پر منتج ہوئی۔'' یہ سات یا دس سالوں کا عرصہ! اور پھر یہ نتائج! تاریخ انسانیت حیران ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ مزید یہ کہ ہماری بے سروسامانی بھی تو دیکھئے۔ جائزہ

ہے کہ

''تحریک پاکستان کی مخالفتوں کا ہجوم جن کا مقابلہ قائداعظم تن تنہا کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے ہم نوا لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں تھے۔ لیکن ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ فوج کے سپاہیوں کی سی تھی۔ ان کا کمانڈر صرف ایک تھا۔ انہوں نے یہ خطرناک جنگ کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی اس کا اعلان انہوں نے ایک اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا۔ ''اورنگ زیب روڈ نئی دہلی پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکرٹیریٹ کہاں ہے، فوج کہاں ہے، میرا اسلحہ خانہ کس قدر ہے۔۔ ایک اٹیچی کیس۔ ایک ٹائپ رائٹر اور پرسنل اسسٹنٹ۔ بس یہ ہے ہمارا ساز و سامان اور اسلحہ اور فوج۔'' مفکر قرآن پرویز صاحب خراج تحسین یوں پیش کرتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ ''اس مرد مجاہد کے کردار کی پاکیزگی اور بلندی ہی تھی جس سے انگریز، ہندو اور خود اسلام کے علمبردار لیڈروں کی پیہم اور متحدہ مخالفتوں کے علی الرغم اس جنگ میں ایسی شاندار کامیابی ہوئی۔'' (طلوع اسلام دسمبر 1984ء)۔

یہ تو تھی محترم پرویز صاحب کی گواہی۔ اب آخر میں لیجئے دشمن کی گواہی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی گواہی سے مستند گواہی اور کس کی ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل انٹرویو دیا کہ ''مسلمانان ہند کو صرف یہ شخص ہی بام ترقی اور بام عروج پر لے گیا ہے۔

مسٹر ڈینس! میں اب عمر کے آخری دور میں داخل ہو گیا ہوں۔ بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس عمر میں غلط بات نہیں کروں گا۔ میں نے سچ بات من و عن بیان کر دی ہے۔ تقسیم ہند کے ڈرامے کا واحد کردار فقط میں ہی باقی رہ گیا ہوں۔ تمام سیاسی زندگی میں جس شخص سے سب سے زیادہ متاثر ہوا، وہ مسٹر محمد علی جناح کی ذات و شخصیت تھی۔ میں نے ان میں منافقت کا شائبہ تک نہ دیکھا۔ اتنا بلند کردار انسان اور قومی لیڈر شاید ہی مسلمانوں کو دوبارہ ملے۔'' (جنگ 24 دسمبر 2001ء)۔

اور تازہ ترین جائزوں میں محترمہ شمیم انور نے، ابھی دسمبر 2001ء میں، اس پہلو کا جائزہ بڑی خوبصورتی سے اور اختصار سے یوں لیا ہے جسے کوزہ میں دریا بند کرنا کہا جائے تو صحیح ہوگا۔ وہ کہتی ہیں ''تاریخ ثابت کرتی ہے کہ بہر حال جناح کے مخالفین میں برطانوی تسلط، جن کی حکومت کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ یعنی اتنی بڑی سلطنت اور قوت کی حامل حکومت، ہندو قوم جس میں ان کے دولتمند برلا و ٹاٹا بھی شامل تھے اور مسلمانان ہند کی ساری مذہبی پیشوائیت اور تنظیمیں بھی۔ ان سب کا مقابلہ جناح نے کیا۔ ان کے پاس محض اور محض اعلیٰ کردار تھا اور دیکھو کیریکٹر کی جیت ہوئی۔ یہ تمام طاقتیں ہار گئیں۔ کیریکٹر بڑی چیز ہے۔'' تو محترم ساتھیو! یہ ثابت ہوا کہ قرآنی کردار کے بغیر اعلیٰ معاشرہ کی تشکیل یا تشکیل پاکستان یا بقاء وطن ممکن نہیں۔ اللہ پاکستان کو برقرار رکھے۔ لیکن اس کے لئے انسان سازی یا کردار سازی پر توجہ دینی ہوگی۔ اسی طرح سے جیسے قرآن حکیم نے کہا ہے۔

میں نے آپ کے سامنے قرآنی حقائق (Universal Laws) کو ماڈرن سائنسی تحقیق سے سمجھانے کی کوشش

کی ہے کہ شاید یہ قوانین آپ کے ''دماغ'' سے ''دل'' میں اتر پائیں۔ مزید یہ کہ محترم مفکرِ قرآن پرویز صاحب کے الفاظ میں ''کرنے کا کام'' یہ ہے کہ

''اس اعتبار سے آنے والے تمام زمانوں کے لئے سیرت رسول اللہ ﷺ اور سیرت خلفاء راشدینؓ اسوۂ حسنہ قرار پائی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سیرت و کردار کے حامل مومن قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ بنابریں جو قوم اسلامی نظام قائم کرنے کا عزم لے کر اٹھے اس کے لئے کرنے کا پہلا کام یہ ہوگا کہ قرآنی تعلیم و تربیت سے مومن پیدا کرے، جو نظام کو قائم کر کے چلا سکیں۔ جب یہ مومن پیدا ہو جائیں گے، تو وہ قرآنی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس نظام کا طریق کار بھی متعین کر لیں گے اور اسلامی قوانین بھی مرتب کر لیں گے۔ اس کے سوا اسلامی نظام کے قیام کی کوئی صورت نہیں۔''

موجودہ حالات میں ہم سب نے، اس سلسلے کے ارتقاء کے لئے زمین ہموار کرنی ہے اور بیج بونے ہیں۔ شاید صدیوں تک! پتہ نہیں فصل کون سی خوش نصیب قوم کاٹے گی۔ لیکن یاد رہے کہ جو بھی جدوجہد آپ سب نے قرآن کے مطابق کی تو ''نظام ربوبیت'' قائم ہونے میں آپ کا بھی ہاتھ ہوگا۔ کتنی بڑی سعادت ہوگی یہ اور انسانیت کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ایسی ہی خدمت سے کردار بنتا ہے اس عملِ پیہم میں ہمیں عام عملی سیاست میں حصہ نہیں لینا۔ نا ہی کوئی ''عوامی'' طریقے اپنانے ہیں۔ غلط ذرائع اور وسائل کا خیال تک دلوں میں نہ لایئے۔

آخر میں میں یہ عرض کروں گا کہ میں اس موضوع کا نام یہ رکھنا چاہتا تھا۔ ''بزموں کی تشکیل و بقا کے لئے قرآنی کردار کی ضرورت'' کیونکہ باباجی کی وفات کے بعد سے ہی ہماری تحریک کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ ہم مسلسل شدید بحران کا شکار ہیں۔ جو جاری ہے بڑی تیزی سے۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے لیکن اگر سمٹا یا جائے تو وجہ اس زوال کی، سبب اس بحران کا بے زری یا وسائل کی کمی نہیں ہے۔ سبب کچھ اور ہے، وہ ہے: ''کردار یا کیریکٹر سازی نہیں ہے'' یعنی زیادہ سے زیادہ شاید ہم اپنی بزموں میں لٹریچر اور درس پھیلا رہے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے اور اس کام کے لئے آپ سب باعث تحسین و آفرین ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے اندر خوشگوار قرآنی کردار تخلیق نہیں کر رہے ہیں۔ نا ہی کردار سازی پر بزموں میں زور شور ہے۔ نا کوئی پلان ہیں، اپنے خاص تقاضوں کے لحاظ سے۔ مکمل طور پر تو کردار سازی نظام قرآنی میں ہی ممکن ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ عملی طور پر ہم کچھ بھی نا کریں۔ یعنی ہمارا کردار تو روائتی پاکستانی، امریکی، برطانوی یا ہندوستانی وغیرہ رہے اور نتائج کچھ اور ملیں!

اب تو بہت سے لوگ اس عظیم ترین قرآنی لٹریچر سے بھی کچھ بور ہو گئے ہیں کہ ہمارے ہاں سے (Some thing new) کے تقاضے ہوتے ہیں کہ جو کچھ موجود ہے وہ کافی نہیں۔ ہماری بزموں میں دوسرے مصنفین کی "Low quality books" یعنی غیر معیاری کتابیں بھی بیچی جاتی ہیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ اور بظاہر وجوہات بہت سی بتائی جاتی ہیں لیکن اصل

وجوہات نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ شعوری و لاشعوری محرکات ہمیں ہڑپ کر جائیں گے۔ قرآنی پیغام پھیلانے کے ساتھ ساتھ اگر ہم قرآنی کردار اپنے اندر تخلیق کرتے رہے تو ہم باقی رہیں گے ورنہ نہیں۔

نوعِ انسانی اور متمدن قوموں کا مستقبل صرف اور صرف خالص قرآنی تعلیمات سے وابستہ ہے۔ جو کہ صرف ہمارے پاس ہے اور کہیں بھی نہیں۔ نفسیاتی و معاشرتی علوم میں یہ بار بار ثابت ہو چکا ہے کہ ''محض کتابیں شائع کرنے سے اور اعلیٰ پائے کے مقرروں کے ذریعے پیغام پھیلانے سے معاشرہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی ہے۔ وہ فکر جو عمل پیہم سے محروم ہو تو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ فکر نیست یا فنا نہ ہو جائے۔'' ڈاکٹر فرام نے اس حقیقت کو یوں بیان کر دیا اور ڈاکٹر گروف Grof جو اس سال 2002ء میں بین الاقوامی سطح کے ماہر نفسیات و سائنسداں ہیں، وہ اس قانون کو یوں سمجھاتے ہیں کہ ''اگر فکر پر عمل نہیں کیا جائے گا تو وہ فکر معدوم ہو جائے گی۔ اس فکر کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال اپنے مشہور لیکچرز کا آغاز ہی یوں کرتے ہیں کہ ''قرآن پاک کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ 'فکر' کی بجائے 'عمل' پر زور دیا جائے۔'' حقیقت یہ ہے کہ بغیر عمل کے حق پر مبنی نظریہ بھی محض ایک تصور بن کر رہ جاتا ہے اور تصور کو اپنے اظہار کے لئے اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے اگر سچے نظریہ کو تھامنے کے لئے افراد میسر نہ ہوں تو وہ صرف کتابوں تک محدود ہو کر ماضی کی یادگار بن جاتا ہے۔

عظیم مفکر و راہنما محترم پرویز صاحب بار بار کنوینشن میں تربیت کے دوران یہ کہا کرتے تھے کہ ''قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں۔ وہ اپنی ذات، اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانین خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو، قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ لیکن اگر ہمارے کردار اور تصورات میں انقلاب پیدا ہو چکا ہے تو یہ کامیابی بڑی کامیابی ہے۔''

وہ بار بار سمجھاتے تھے کہ ''قرآن کریم کا حقیقی مقصد انسان کی سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا ہے کہ اتباعِ کتاب کا پہلا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ خود تمہاری اصلاح ہو۔ لیکن تم دوسروں کی اصلاح کے پیچھے تو لٹھ لئے پھرتے ہو، لیکن اپنی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔'' اور یہ کہ

''آپ نہ تو اپنی دعوت کے نتائج کی سست روی سے گھبرایئے اور نہ ہی سامریانِ عصر حاضر کی کامیابی کو ان کے مسلک کی صداقت کی علامت سمجھئے اور اسے اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اس میں سب سے زیادہ گراں بہا متاعِ سفر اور محکم ترین سامانِ حفاظت، آپ کی سیرت کی بلندی اور کیریکٹر کی پختگی ہے۔ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز، آپ کی اپنی ذات کے ساتھ دیانت اور دوسروں کے ساتھ حسن معاملہ میں پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر یہ جوہر پیدا کر لیے تو پھر آپ کو دنیا کی کوئی

طاقت شکست نہیں دے سکتی ہے۔'' ہم نے اس طرح کا سب کچھ پسِ پشت ڈال دیا ہے پھر اپنی تباہی کی وجہ پوچھتے ہیں۔

قرآن حکیم کی اقدار یا Values کے مطابق چلنے کی کوشش مسلسل کرنے سے اور ساتھ ساتھ اس پیغام عظیم کو عام کرنے سے ہمیں ہماری منزل مل جائے گی۔ جسے ''کردار'' یا ''کیریکٹر'' کہتے ہیں۔اس طرح سے پیام قرآنی بہت تیزی سے پھیلے گا۔ جیسا کہ محترم پرویز صاحب کی زندگی کے ماڈل سے ثابت ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ اسی طرح سے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق کرنا ہوگا۔اس پرامن اور آئینی اوراحسن طریقے سے جو صبر طلب اور محنت طلب بھی ہے' ہم سے قربانیاں بھی مانگتا ہے' اس سے بڑے گہرے اور دور رس اثرات نوع انسانی پر مرتب ہوتے ہیں۔شاید سائنس میں ''کونز'' اسے Miami Effect کہتا ہے اور کووے Covey کی اصطلاح میں Whale Effect اور ڈاکٹر فرام کے الفاظ میں Integrated-Step کہتے ہیں۔مثلاً قائداعظم کے آٹھ یا دس سال کا قلیل عرصہ اور محترم پرویز صاحب کی بے سروسامانی اور ہر طرف سے شدت کی مخالفت اور پھر تمام دنیا میں ان کے کام کے اثرات جو تیزی سے پھیلے اور مزید پھیلیں گے وغیرہ۔ یہ زندہ مثالیں ہیں۔ یہ سب صرف کردار سے ممکن ہے۔قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ ''اپنے اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور حالات وکوائف نے تمہیں جس منزل میں رکھا ہے وہیں سے حصول مقصد کی ابتدا کر دو۔((33/46۔تو عزیز بھائیو' بہنو اور بزرگو ہو سکے تو آج سے یہ کردار سازی کا کام شروع کر دیں۔ پھر دیکھئے خدا کا قانون آپ کو کیا بنا دیتا ہے۔ ورنہ ہم کتنی بھی بزمیں دنیا میں بنا لیں۔کسی طرح کی بھی بنا لیں' یہ سب کچھ ممفورڈ کے الفاظ میں محض Decorative-Style ہوگا اور کچھ بھی نہیں اور قرآن حکیم کے معیار کے مطابق کہ ''تم نے محض چند نام رکھ دیئے ہیں جن کی حقیقت محض ناموں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔''

اللہ تعالیٰ آپ کو قرآنی کردار کی تخلیق کی توفیق عطا فرمائے۔قرآنی کردار کا دوسرا مطلب ہے کہ نوع انسانی کے لئے ہم روزانہ کیا دیتے ہیں۔سرمایہ زدہ ذہنیت کا تقاضا ہے''لینا'' اور زیادہ سے زیادہ لینا' لیکن اس سے کردار ٹتا چلا جاتا ہے' ذات برباد ہوتی جاتی ہے اور انسان پست سے پست ترین حالت کی طرف چلتا چلا جاتا ہے۔یعنی اسفل سافلین۔اس کے برعکس جو دیتا ہے یا زیادہ سے زیادہ فلاح نوع انسانی کے لئے دیتا ہے' وہ فلاح پاتا ہے۔اسی کی نشونماءِ ذات ہوتی چلی جاتی ہے۔یعنی آپ کے سامنے ارجنٹ ترین سوال ومعاملہ یہ ہے کہ ''میں دوسروں کے لئے بہتر سے بہتر کیا کر سکتا ہوں؟ What Best I can do for Others? اور یاد رکھئے کہ جب تک اس سوال کا جواب عملی طور پر آپ کی زندگی سے نہیں ابھرتا' مسلسل ومتواتر' آنے والی بقا یا زندگی میں' تو کردار نام کی چیز کا خیال بھی دل سے نکال دیجئے اور قرآنی پیغام تو ایسے لوگ پھیلا ہی نہیں سکتے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سب سنجیدگی سے بار بار ان حقائق پر غور وفکر کریں گے اور زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں گے کہ یہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔اللہ آپ سب کو خوش وخرم رکھے اور آپ کو کامیابیاں عطا کرے۔

پاکستان زندہ باد

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اعجاز القرآن

اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں اور انسان کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں ایک نگاہ میں الگ الگ ہوجاتی ہیں۔ جو لوگ سو سو منزلہ عمارات تعمیر کرسکتے ہیں۔ وہ ایک پھول، ایک کلی، ایک پتا نہیں بنا سکتے۔ کائنات اللہ کا فعل ہے۔ قرآنِ کریم اللہ کا قول ہے۔ ان میں باہم تضاد نہیں ہوسکتا۔ انسان نہ تو کائنات کی کوئی چیز بنا سکتا ہے اور نہ ہی اللہ کا کلام بنا سکتا ہے، اللہ کے فعل وقول کا مقابلہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ جب سے قرآن نازل ہوا ہے اس کا برابر یہ ہی دعویٰ رہا ہے کہ میں خدائے قدوس کا کلام ہوں۔ جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین، خدا کا سورج جیسا سورج اور خدا کا آسمان جیسے آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی۔ قرآن کو مٹانے کی لوگ سازشیں کریں گے، مکر بنائیں گے، مقابلہ کے جوش میں کٹ مریں گے اپنی مدد کے لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے، کوئی حیلہ، کوئی بہانہ، کوئی تدبیر، کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے۔ اپنے کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے۔ سارے مصائب و دوا ہی کا تحمل ان کے لئے ممکن ہوگا مگر قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا لانا ممکن نہیں ہوگا قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (17:88) ترجمہ: اے رسول! تم کہہ دو کہ اگر (ساری دنیا جہان کے) آدمی اور جن اس بات پر جمع ہوں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو اس کے برابر نہیں لا سکتے اگر اس کوشش میں ایک کا ایک مددگار بھی بنے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ حضور ﷺ کے عہد میں جن لوگوں نے اپنی جانیں دیدیں، مال تک لٹا دیا، گھر بار لٹ گیا، حکومت چلی گئی تولیتِ کعبہ چلی گئی، کیا انہوں نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ اس کے مقابلہ کی ایک سورت بنالیں۔ پھر اس چودہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں کے دشمنوں نے کبھی اس کی ہمت نہیں کی۔ صلیبی جنگیں ہوئیں۔ سارے یورپ کی ساری عیسائی حکومتیں تین سو سال تک مسلمانوں سے لڑتی رہیں، ان تمام جنگوں کی کیا ضرورت تھی۔ مشرق وسطی میں غیر مسلم عرب ادیب و بلغاء بھرے پڑے

انسان نہ تو کائنات کی کوئی چیز بنا سکتا ہے اور نہ ہی اللہ کا کلام بنا سکتا ہے، اللہ کے فعل وقول کا مقابلہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ جب سے قرآن نازل ہوا ہے اس کا برابر یہ ہی دعویٰ رہا ہے کہ میں خدائے قدوس کا کلام ہوں۔ جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین، خدا کے سورج جیسا سورج اور خدا کے آسمان جیسے آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی

تھے، کسی نے ایک سورۃ نہیں لکھی ۔ ہندوستان میں غدر کے بعد برٹش گورنمنٹ کی زیرنگرانی بڑے بڑے مناظرے ہوتے تھے۔ مسلمان علماء ان کو بار بار چیلنج کرتے تھے۔ عیسائی پادریوں میں پادری Sale پادری فنڈزاور دیگر مناظر موجود ہوتے وہ عربی کے سکالر تھے۔ Sale کا ترجمہ قرآن آج تک ملتا ہے لیکن کسی نے ایک سورہ بنانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ لَا رَیْبَ کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے وحی الٰہی ہونے کے کچھ دلائل تو خود قرآن نے دیئے ہیں اور کچھ دلائل اس پر غور کرنے سے، علماء مفسرین کے سامنے آئے ہیں۔ جب آپ قرآن پر غور کرنے کے لیے بیٹھے ہیں تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ماضی کے سابقہ نظریات پر Stick نہ کریں اور ان کو کم سے کم اہمیت دیں کیونکہ قرآن نے فرمایا لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَؕ (56:79) اس کے مفہوم کو وہ ہی جان سکتے ہیں جو پاک ہوں۔ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ کے فوائد میں حضرت شاہ محمد اسحٰق کے حوالہ سے تحریر ہے ''اور بعض نے لَّا یَمَسُّهٗۤ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع کی ہے یعنی اس قرآن کو نہیں چھوئے گا مگر پاک لوگ یعنی جو صاف دل اور پاک اخلاق رکھتے ہیں۔ وہ ہی اس کے علوم وحقائق تک ٹھیک رسائی پاسکتے ہیں۔''

> قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کی ایک دلیل جو سب لوگوں کے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم انسانیت کے اس موجود دور کے مسائل حل کرتا ہے تو وہ یقیناً وحی الٰہی ہے اور اگر وہ انسانیت کے مسائل حل نہیں کرتا تو وہ وحی الٰہی نہیں ہے

قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کی ایک دلیل جو سب لوگوں کے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم انسانیت کے اس موجود دور کے مسائل حل کرتا ہے تو وہ یقیناً وحی الٰہی ہے اور اگر وہ انسانیت کے مسائل حل نہیں کرتا تو وہ وحی الٰہی نہیں ہے۔ نزولِ قرآن کے دور میں اور اس وقت بھی ہر طرف مذہب رائج ہے جو انسانیت کے مسائل حل کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ مذہب کی دوسری خامی اور اس کی کمزوری یہ ہے کہ اس کے نتائج اس دنیا میں سامنے نہیں آتے اس لیے یہ بات طے نہیں ہوسکتی کہ کون سا مذہب درست ہے اور کونسا مذہب باطل ہے اس معاملہ میں دین کے حق و باطل پر ہونے کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ دین کے درست ہونے کے دو ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں۔ دین کے درست ہونے کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مسائل حل کرتا ہے اور اس کے درست ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ قرآنِ کریم انسانیت سے جو وعدے کرتا ہے یہ نظام ان وعدوں کو پورا کرتا ہے۔ اگر قرآنی نظام قرآن کے دعوؤں کو پورا کرتا ہے تو وہ وحی الٰہی ہے اور اگر اس کا نظام اس کے وعدوں کو پورا ہی نہیں کرتا تو قرآن وحی الٰہی نہیں ہے۔ ان دونوں دلائل کے لئے ہم آیات پیش خدمتِ عالی کرتے ہیں۔ فرمایا: بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ‌ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ فَانْظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ۝۳۹ (10:39) انہوں نے اس قرآن کو اس لئے جھٹلا دیا کہ اُنہوں نے اس کا علمی احاطہ نہیں کیا اور اس کے نتائج بھی سامنے نہیں آئے تھے، اس سے پیشتر بھی لوگوں نے اسی طرح جھٹلایا تھا بس تم ظالموں کا انجام خود دیکھ لو۔

قرآن کی تکذیب وہ کرتا ہے جس نے اس کا اپنے دور کے علم کے مطابق احاطہ نہیں کیا۔ یہ ایسی آیات ہوتی ہیں جن سے قرآن کا وحی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہاں قرآن نے صرف علمی احاطہ نہ کرنے کو تکذیبِ دین کا سبب نہیں بتایا بلکہ ضمیرہ کا مرجع علم ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے دور کے علم کے مطابق احاطہ نہیں کیا۔ انسانی فکر اور انسانی علوم بڑھتے جا رہے ہیں اور ہر شخص کو اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق احاطہ کرنا اس کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ وحی الٰہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ علمی احاطہ ایک نظری اور فکری چیز ہے۔ فرمایا یہ کوئی نظری بات نہیں ہے بلکہ میں ایک نظام دیتا ہوں اور یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اس کے دعووں کے نتائج ضرور سامنے آئیں گے اس کا دعویٰ ہے کہ جو قوم اس نظام کو جاری کرے گی، وہاں ہر شخص کو رزق فراہم ہوگا (11:6) اگر یہ دعویٰ پورا ہو جائے تو قرآن وحی ہے اور اگر اس کے وعدے پورے نہ ہوں تو وہ وحی نہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس نظام میں کسی کو خوف و حزن نہیں ہوگا (2:38) آپ وہ نظام قائم کریں اس میں سب لوگ خوش حالی سے زندگی بسر کریں گے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ قرآنی نظام میں سب لوگوں کی خوابیدہ صلاحیتیں اور توانائیاں بیدار ہو جاتی ہیں۔ آپ یہ نظام قائم کر کے خود اندازہ کر لیں کہ لوگوں کی صلاحیتیں اس نظام میں Actualize ہوتی ہیں یا نہیں

قرآن نے اپنے بے مثل ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے وہ صرف اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے نہیں کہا کیونکہ اس طرح کا چیلنج تو صرف عربوں کے لیے ہوسکتا تھا۔ قرآن کا دعویٰ اپنے Contents کی وجہ سے بھی تھا ارشاد ہوا قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ (28:49)، ترجمہ تو کہہ دے تم کوئی کتاب اللہ کے پاس کی لاؤ جو ان دونوں سے بہتر ہو میں اس کا اتباع کروں گا

قرآنی نظام کے مبنی برحق ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ قرآن نے حضور ﷺ سے کہلوایا يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ (6:135) تم ان کفار و مشرکین سے علی الاعلان کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو میں اپنے پروگرام پر عمل کرتا ہوں۔ نہ میں تمہارے کام میں مداخلت کرتا ہوں اور نہ تم میرے کام میں مداخلت کرو فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔۔۔ تمہیں بہت جلد یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔۔۔ انجام کار کامیابی کس کو نصیب ہوتی ہے اور کس کا پروگرام درست ہے اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:135) قرآن کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ ظالم کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جو ظلم کے مٹانے کے لیے وہ نظام جاری کرتا ہے جو حق پر مبنی ہو، اور عدل کی ترازو اس کے ہاتھ میں ہو۔

قرآن نے اپنے بے مثل ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے وہ صرف اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے نہیں کہا کیونکہ اس طرح کا چیلنج تو صرف عربوں کے لیے ہوسکتا تھا۔ قرآن کا دعویٰ اپنے Contents کی وجہ سے بھی تھا ارشاد ہوا قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ (28:49)، ترجمہ تو کہہ دے تم کوئی کتاب اللہ کے پاس کی لاؤ جو ان دونوں سے بہتر ہو میں اس کا اتباع کروں گا۔ قرآن کا یہ چیلنج تھا کہ فکرِ انسانی ایسے قوانین یا ایسا نظام وضع نہیں کر سکتا جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ قرآن دعویٰ یہ کر رہا ہے کہ یہ قوانین انسانی فکر نہیں بنا سکتا کیونکہ اس نے چند آیات پیشتر یہ فرمایا لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ

رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (32:2) سب سے بڑی خوبی وصفت اس ضابطۂ قوانین کے دینے والے کی یہ ہے کہ وہ ضابطہ دینے والا اور وہ ضابطہ حیات خود دونوں ربوبیتِ انسانیت کے ذمہ دار ہیں۔ اس نظام میں ہر شخص کی ربوبیت کی ذمہ داری اس نظام پر ہے۔ ایسی ربوبیت کہ اس میں جسمانی ربوبیت بھی ہو اور اس کی ذات کی ربوبیت بھی اس میں شامل ہو۔ یہ ضابطۂ حیات سب انسانوں کے لیے یکساں ہے اور اس میں اور خارجی کائنات میں ایک ربط باہمی بھی ہوتا ہے، جو ربط اس وقت فکرِ انسانی اپنی گرفت میں نہیں لا سکا۔ قرآن نے حرام مال کھانا، ناجائز قرار دیا ہے۔ حرام مال کھانے سے انسانی ذات پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خارجی کائنات کے قوانین جو ملائکہ کہے جاتے ہیں وہ نفسِ انسانی پر یہ اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان اثرات کو مرتب کرنے میں ملائکہ کیا Part Play کرتے ہیں، فکرِ انسانی اب تک اس کی گرفت نہیں کرسکا۔ جس دن فکرِ انسانی نے اس پر گرفت کر لی اس دن یہ دنیا جنت بن جائے گی۔ اس ضابطۂ حیات جیسا ضابطہ لانے کی تحدی قرآن صرف اپنے دور کے لوگوں کو ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ قیامت تک کے لوگوں کو یہ تحدی کرتا ہے، اس چیلنج کے علاوہ مزید یہ چیلنج کرتا ہے کہ تم ایسا ضابطۂ حیات بنا ہی نہیں سکتے وَلَنْ تَفْعَلُوْا (2:24)، آپ غور کریں کہ کتنا بڑا چیلنج قیامت تک کے لیے قرآن کس جرأت اور حوصلہ سے کر رہا ہے اور اس کا یہ چیلنج آج تک اپنی جگہ جم کے کھڑا ہے۔

احادیث کی زبان بڑی معیاری زبان ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بھی احادیث کے درمیان اگر ایک مختصر سی آیت درمیان میں آجائے تو قاری کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیتِ قرآنی ہے۔ قرآنِ کریم کی زبان اور احادیث کی زبان میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ چونکہ حضور ﷺ خود قریش میں سے تھے، اس لئے حضور ﷺ کی اپنی زبان نہایت بلیغ وشستہ تھی۔ آپ احادیث کی کوئی کتاب ملاحظہ فرمائیں، آپ ان احادیث کی بہترین زبان پائیں گے۔ اگر کسی حدیث کی زبان معیاری نہیں ہوتی، تو محدثین اس کی اسناد کے قوی ہونے کے باوجود اس حدیث کو مسترد کر دیتے ہیں۔ احادیث کی زبان بڑی معیاری زبان ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بھی احادیث کے درمیان اگر ایک مختصر سی آیت درمیان میں آجائے تو قاری کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیتِ قرآنی ہے۔ قرآنِ کریم کی زبان اور حادیث کی زبان میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ بات یقیناً غور کرنے کی ہے کہ تئیس سال کے طویل عرصہ میں کوئی شخص متواتر دو زبانیں نہیں بول سکتا۔ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے قرآن کی زبان کا معیار ہر جگہ ایک ہی ہے۔ ایک شخص تحریر کی ایک صنف رزمیہ شاعری کا ماہر تھا۔ شاہنامہ اس کا شاہکار ہے۔ سارا شاہنامہ رزمیہ شاعری میں ہے۔ وہ اخلاقیات کا شاعر نہیں تھا۔ سعدی اخلاقیات کا شاعر تھا رزمیہ شاعری ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہماری اپنی زبان اردو میں میر ببر علی انیس مرثیہ نگاری کے بادشاہ تھے پانچ پانچ سو بند کے مراثی نہایت روانی سے، بلاتکلف لکھتے چلے جاتے تھے لیکن غزل نہیں لکھ سکتے تھے۔ غالب غزل کا بادشاہ تھا۔ غالب شیعہ ہونے کے باوجود مراثی نہیں لکھ سکتا تھا۔ قرآنِ کریم کا انداز ہی نرالا ہے۔ وہ رزم، بزم، جنگ وصلح، میراث کا پورا قانون

صرف دو آیات میں بیان کر دیتا ہے۔ ان دو آیات میں اتنا مواد ہے کہ ہر طرح کے حصص کو یہ Cover کر لیتی ہیں۔ ان آیات کو سمجھنے کے لیے Legal Acumen اور ریاضی کا معمولی سا علم ہونا ضروری ہے یہ دونوں علوم نہایت سخت خشک و یابس ہوتے ہیں لیکن ان علوم کی یبوست کے باوجود ان دونوں آیات میں بلاغت کا وہی معیار ہے جو دوسرے مقامات پر ہے ذرّہ بھر کمی محسوس نہیں ہوتی۔

قرآنِ کریم کی فصاحت وبلاغت ایک Relative term ہے جس کا تقابل کیا جاسکتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں بلغاء وفصحاء ہوگذرے ہیں۔ عربی زبان کے ماہر مسلمان بلغاء نے بھی قرآن کی تحدی کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن قرآنِ کریم کی تین مخصوص خصوصیات ایسی ہیں جو کوئی شخص بھی اختیار نہیں کرسکتا۔ یہ کسی انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔

قرآن کی ایک خصوصیت تصریف آیات اور اس کے ذریعے تفسیر القرآن بالقرآن ہے یعنی تصریف آیات سے قرآنِ کریم کو سمجھنا۔ قرآن کریم کا یہ انداز نگارش کوئی ہنگامی، اتفاقیہ، یا غیرارادی نہیں ہے۔ قرآن نے اس اندازِ نگارش کو بہت سوچ سمجھ کے بعد اختیار کیا ہے۔ جس کی نشاندہی خود قرآن نے کردی ہے ارشاد ہوتا ہے: اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ۝ (6:65) اے رسول غور فرمائیں ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ لوگ اس میں تفقہ کریں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ۝ (6:46) اے رسول غور کریں ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں۔ پھر بھی یہ لوگ ہیں کہ تصریف آیات سے اعراض کرتے ہیں۔ قرآن نے خود حضور ﷺ کے متعلق بھی فرمایا کہ حضور ﷺ کا طریقہ تبلیغ بھی تصریف آیات ہی تھا۔

> اس کتاب میں محکمات وہ ہیں جو ان احکام پر مشتمل ہیں جن کے دو معنی نہیں ہوسکتے۔ چونکہ یہ احکامات ہر معاشرے کے لیے ضروری ہیں اس لئے ان کو محکمات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کی بنیادی تعلیم پر مشتمل ہیں اور ان احکامات پر ہر معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے اور یہ احکامات ایک مملکت کو چلانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے ان کو اُمُّ الْكِتٰبِ کہا ہے

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۝ (6:105)

مفہوم: اور اے رسولؐ ہم اسی طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تا کہ آپ تصریف آیات کے ذریعے درس دیا کریں) اور تا کہ لوگ یہ کہہ دیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا ہے (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تا کہ ہم عقلمندوں کے لیے اپنی آیتوں کی خود تبیین کردیں۔ قرآنِ کریم کوئی درسی نصابی کتاب نہیں ہے کہ اس میں موضوعات کے مطابق ابواب (Chapters) قائم کئے جائیں اور ایک موضوع سے متعلقہ سارا مواد ایک مقام پر اکٹھا کردیا جائے۔ قرآنِ کریم نے تصریف آیات کا یہ Style ہی اس لئے اختیار کیا ہے کہ کوئی اس کی مثال نہ لاسکے۔ قرآن کا یہی دعویٰ ہے کہ جن وانس میں

سے کوئی شخص تصریف آیات کا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا خواہ سب جن وانسان ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں (17:88)

آیاتِ قرآنی کو Chapter wise تحریر میں لانا ''تبویب القرآن'' کہلاتا ہے۔ تبویب القرآن آیات کو موضوعات کے مطابق جمع کر کے تحریر کیا جاتا ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ تبویب لکھنے کے لیے سارے قرآن پر بیک وقت نگاہ ہونی چاہئے، تحریکِ طلوعِ اسلام کے بانی جناب پرویز صاحب، داعیٔ اسلام، علیہ الف الف تحیۃ والسلام، نے تبویب القرآن تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے قرآنِ کریم کی عظمت اور اس کا اعجاز نمایاں ہوتا ہے، کہ کس طرح قرآن مختلف مقامات پر ایک ہی موضوع کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تقریباً 32 ہزار موضوعات پر روشنی ڈالی ہے یہ کتاب ہماری Website پر موجود ہے۔ زیادہ نہیں تو آپ اس کے صرف 5 موضوعات پر نگاہ ڈالیں مثلاً ارتقاء، صفحہ 97 تخلیق ارض وسماء صفحہ 1422، یہ تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ اس کتاب کے موضوعات کا تنوع ہی اعجاز القرآن کی دلیل ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں ذہنِ انسانی اتنے موضوعات کو سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ چہ جائیکہ ان کی تفصیلات تک یہ گفتگو کر دی جائے۔

> آج سے ایک سو سال کے بعد جب فکرِ انسانی نے مزید ترقی کر لی ہوگی اور علوم انسانی بہت وسیع ہو چکے ہوں گے، ان متشابہات آیات کا مفہوم مزید واضح ہوجائے گا اور اس کا مفہوم مستقبل کے دور کے مطابق ہوگا۔ آخری دور میں یہ ساری متشابہ آیات محکمات میں تبدیل ہوجائیں گی۔

تصریف آیات کے علاوہ طرزِ نگارش کے سلسلہ میں ہی قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے بارے میں دوسرا ثبوت قرآنِ کریم کی آیات کا محکمات ومتشابہات میں منقسم ہونا ہے۔ دنیا کی کسی کتاب نے اپنے مندرجات کو محکمات ومتشابہات میں تقسیم نہیں کیا۔ صرف اور صرف قرآن نے یہ انداز اختیار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ کتاب قیامت تک کے لئے ایک ہدایت نامہ ہے۔ اس لئے اس کو اس طرح تقسیم کرنا ضروری تھا۔ اس کتاب میں محکمات وہ ہیں جو ان احکام پر مشتمل ہیں جن کے دو معنی نہیں ہو سکتے۔ چونکہ یہ احکامات ہر معاشرے کے لیے ضروری ہیں اس لئے ان کو محکمات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کی بنیادی تعلیم پر مشتمل ہیں اور ان احکامات پر ہر معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے اور یہ احکامات ایک مملکت کو چلانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے ان کو اُمُّ الْکِتٰبِ کہا ہے (3:7)۔

دوسری قسم کی وہ آیات ہیں جن کا تعلق مملکت کے روزمرہ کے قوانین سے نہیں ہوتا یہ متشابہات ہیں اور ان کے بغیر مملکت چل سکتی ہے۔ آیات متشابہات کا مفہوم انسانی علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ مزید واضح ہوتا چلا جاتا ہے ان آیات کو ہر دور کے انسان اپنے اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق سمجھتے چلے جائیں گے۔ فکرِ انسانی کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان آیات کا مفہوم مزید واضح ہوتا چلا جائے گا جو شخص ان آیات کو آج سمجھے گا وہ اس موجودہ دور کی علمی سطح کے مطابق سمجھے گا۔ ان کے سمجھنے کے لئے ہر دور کی علمی سطح کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ کسی بھی دور کے انسان کو یہ لکھنے کا حق نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کر سکے کہ اس کا

فہم قرآن، آخری فہم ہے۔ آج سے ایک سو سال کے بعد جب فکرِ انسانی نے مزید ترقی کر لی ہوگی اور علوم انسانی بہت وسیع ہو چکے ہوں گے، ان متشابہات آیات کا مفہوم مزید واضح ہو جائے گا اور اس کا مفہوم مستقبل کے دور کے مطابق ہوگا۔ آخری دور میں یہ ساری متشابہ آیات محکمات میں تبدیل ہو جائیں گی۔ یہ موضوع بہت طویل ہے۔ ہم اس سلسلہ میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بڑی کثیر تعداد میں آیات پیش کر سکتے ہیں، لیکن اس مختصر مضمون میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہے وہ ہماری کتاب اعجاز القرآن ملاحظہ فرمائیں وہاں یہ آیات تحریر کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ہماری Website پر پڑی ہے۔ اس کتاب اعجاز القرآن کے بارے میں بطورِ تحدیث نعمت یہ عرض کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ اس کتاب میں قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے ثبوت میں اتنا مواد پیش کیا گیا ہے کہ اگر آپ اس کو ملاحظہ کریں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ قرآن کریم آپ کی آنکھوں کے سامنے نازل ہو رہا ہے۔

> کسی آیت کو سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے تو آپ ان صفات پر غور فرمائیں۔ ان صفات پر غور کرنے سے آیت کے مفہوم کا ایک Clue معلوم ہو جاتا ہے۔ صفاتِ خداوندی کو آیات سے اس طرح ربط دینا، صرف وحی ہی کر سکتی ہے۔

اعجاز القرآن کے بارے میں ایک بڑی مضبوط دلیل جو ہمارے نزدیک حجت قاطعہ اور اُم الادلہ کا درجہ رکھتی ہے یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ موقف ہے کہ ذہن انسانی اللہ تعالیٰ کی کنہ و ماہیت کا ادراک نہیں کر سکتا اس لئے اس نے اپنی صفات بیان فرمائی ہیں۔ ان صفات کا تفصیلی تعارف ہم اس مضمون میں بیان کریں گے جس میں اسلامی نظام کے متعلق مفصل بحث پیش کی جائے گی۔ یہاں ہم ان صفاتِ خداوندی کے متعلق اتنا ہی تحریر کریں گے جس کا تعلق اعجاز القرآن سے ہے۔

ان صفاتِ خداوندی کی رُو سے خدا کا جو تصور ہمارے سامنے آتا ہے، اس سے بلند، پاکیزہ اور مکمل تصور اور کسی جگہ نہیں مل سکتا۔ یہ صفاتِ خداوندی فلسفہ کی زبان میں بالقوہ انسانی ذات میں موجود ہوتی ہیں اور ان کی بالفصل نمود و نشوونما کرنا انسانی زندگی کا فریضہ ہے۔ جب آپ قرآنِ کریم پر غور و فکر کرتے ہیں تو آپ یہ ملاحظہ فرمائیں گے کہ قرآنی آیات کے بعد ان صفات میں سے کوئی سی صفت یا صفات ان آیات کا جزو ہوتی ہیں۔ ہمارے مفسرین کرام نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی کہ ان صفات کا تعلق ان آیات سے بڑا گہرا ہوتا ہے اور آپ جس قدر ان صفات پر غور کریں گے، ان کا ربط واضح ہوتا چلا جائے گا۔ جس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قوت کا ذکر ہوتا ہے وہاں اس آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ صفت العزیز بیان کی گئی ہوگی۔ جس آیت میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت کرنے کا ذکر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو غلب اعمال کے نتائج سے محفوظ کر لیتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی صفت غفور کو ضرور بیان کیا جاتا ہے۔ جس جگہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی حکمت بیان کی جاتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی صفت الحکیم کو بیان کیا جائے گا۔ ان صفاتِ خداوندی میں آیات کا مفہوم Sum up کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی آیت کو سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے تو آپ ان صفات پر غور فرمائیں۔ ان صفات پر غور کرنے سے آیت کے مفہوم کا

ایک Clue معلوم ہوجاتا ہے۔ صفاتِ خداوندی کو آیات سے اس طرح ربط دینا، صرف وحی ہی کرسکتی ہے۔ فکرِ انسانی اتنی صفات، اس قدر بلند معانی کے ساتھ گرفت میں لا ہی نہیں سکتی اور مزید یہ کہ ان کو آیات سے ربط دینا ناممکن کام ہے اگر یہ قرآن وحی نہیں ہے اور نعوذ باللہ حضور ﷺ کا خود تحریر کردہ ہے تو حضور ﷺ اپنے ساتھ قرآن تحریر کرنے کے لیے نوٹس لئے نہیں پھرتے تھے کہ ان کو یہ بات یاد رہتی تھی کہ کس آیت کے ساتھ کون سی صفت لکھی جاچکی ہے اور کون سی صفت باقی ہے جس کو کسی مناسب موقع پر تحریر کرنا ہے۔ اب موجودہ دور میں قرآن فہمی کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی عالم دین ایسی تفسیر تحریر کرے جس میں آیات وصفات کا ربط بخوبی واضح کردیا جائے۔ اب تک ایسی تفسیر تحریر نہیں ہوئی ہے۔ آیات وصفات کے ربط کے سلسلہ میں ہم نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کے ثبوت کے لئے چند آیات پیش ہیں۔

1۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٧﴾ (45:37) اور ہر ایک شخص اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ فی الحقیقت ساری کائنات میں اقتدار اختیار صرف ایک خدا کا ہے ہر شے پر اسی کا غلبہ ہے اور یہ غلبہ حکمت پر مبنی ہے۔

2۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١﴾ (57:1) کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے متعین پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔ وہ بڑے ہی غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ اندھی قوت نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔

3۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٨﴾ (57:28) اے جماعت مومنین تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور جو کچھ تم سے تمہارا رسول وحی کی رو سے کہتا ہے اس پر یقین رکھو اور اس کی اطاعت کرو اس طرح وہ تمہیں سامانِ رحمت وربوبیت کے دو حصے دے گا اور تمہیں ایسی شمع نور عطا کردے گا کہ تم زندگی کی جن راہوں پر بھی چلو گے وہ روشن ہوتی جائیں گی اور اس طرح تم ہر قسم کی تباہی وبربادی سے محفوظ رہو گے۔ یاد رکھو اللہ کے نظام میں تباہیوں سے حفاظت اور زندگی کی نشوونما کا سامان دونوں موجود ہیں۔

4۔ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴿١﴾ (58:1) ترجمہ: اللہ نے اس عورت کی بات سنی جو تجھ سے (اے رسول) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی۔ اللہ تم دونوں کے سوال اور جواب کو سن رہا تھا وہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہاں صفاتِ خداوندی میں سے سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴿١﴾ کا کیسا مضبوط ربط ہے۔

5۔ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۚ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۚ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿٢﴾ (58:2) ترجمہ: تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کو ظہار کردیتے ہیں وہ کچھ ان کی مائیں نہیں ان کی مائیں تو بس وہی ہیں جو ان کو جنتی ہیں اور وہ بیشک ایک نامعقول اور جھوٹ بات کہتے ہیں۔ بیشک

خدا معاف کرنے والا اور حفاظت کرنے والا ہے۔

6۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾ (58:12) ترجمہ: اے ایمان والو! جب پیغمبر سے کوئی بات کان میں کہنی چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کوئی خیرات دے دیا کرو۔ یہی تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ ہے۔ پس اگر تم کو اس کا مقدور نہ ہو تو خیر تم رسول سے بات کہہ لیا کرو اللہ کے قانون میں ایسے مواقع کے لیے رعایت رکھ دی گئی ہے کیونکہ اس سے مقصد تو تمہاری حفاظت و تربیت ہے۔ تم پر سختی کرنا مقصود نہیں۔

7۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱﴾ (59:1) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہے اس خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے جو بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کی قوت اندھی فطرت کی قوت نہیں وہ یکسر حکمت پر مبنی ہے۔

8۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۶﴾ (60:6) یہ تھا ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کا وہ طرزِ عمل جس میں ہر شخص کے لیے پیروی کا عمدہ نمونہ ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو جو شخص اس طرزِ عمل سے روگردانی کرے گا تو اس سے اس کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ خدا کا کچھ نہیں بگڑتا وہ اس سے بے نیاز ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ وہ اپنی ذات میں جملہ ستودہ صفات کا مالک ہے۔

9۔ وَ كَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَ اِیَّاكُمْ ۖ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۶۰﴾ (29:60) کتنے ذی حیات ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں یا اس کا ذخیرہ کرتے ہیں؟ ان سب کو خدا کے کائناتی قانونِ ربوبیت کے مطابق سامانِ رزق ملتا ہے۔ لہٰذا تم بھی اپنے ہاں ویسا ہی نظام قائم کر لو تم سب کو رزق ملتا رہے گا اس لئے کہ وہ سب کی سنتا ہے اور ہر ایک کی ضروریات سے واقف ہے۔

10۔ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۰﴾ (9:40) اور اللہ کا نظام ہمیشہ اوپر رہے گا اور اللہ قوت اور حکمت والا ہے۔ اس نظام میں صحیح تدابیر اور قوت دونوں موجود ہیں چونکہ نظام کے غلبہ کا ذکر ہے اس لئے یہاں عزیز کی صفت لائی گئی ہے۔

11۔ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ﴿۱۲۶﴾ (3:126) ترجمہ: لیکن یہ سب کچھ تو صرف تمہیں بشارت دینے کے لئے ہے اور تمہارے اطمینان کی خاطر ورنہ کامیابی تو صرف اللہ کی طرف سے ہے کہ وہ عزیز و حکیم ہے۔ چونکہ نصرت اور مدد دینے کا ذکر ہو رہا ہے اس لئے یہاں صفت العزیز بیان کی گئی ہے۔

12۔ وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۱۸﴾ (2:218) اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے وہ اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اللہ حفاظت دینے والا، نشوونما کرنے والا ہے۔ غفور کے معنی حفاظت کرنے والا ہے اور رحیم کے معنی نشوونما دینے والا۔ دونوں صفات کا آیت سے گہرا تعلق ہے۔

13۔لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (6:104) ترجمہ اسے نگاہیں نہیں پاسکتیں لیکن وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے۔وہ بڑا ہی باریک بین اور آگاہ ہے۔

نزولِ قرآن کے دوران ساری انسانیت میں روح اور روحانیت کا تصور پھیلا ہوا تھا۔قرآنِ کریم نے روح اور روحانیت کے اس عالمگیر تصور کی تردید کی۔قرآنِ کریم کا تصورِ زندگی یہ ہے کہ وہ تخلیق انسانی کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد جن مراحل کا تعلق اس کی طبعی ساخت سے ہے،اور جن مراحل میں حیوانات بھی شامل ہیں،قرآن کہتا ہے وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (32:9)،خدا نے اس میں اپنی طرف سے ایک توانائی ڈال دی۔تو اس سے قرآن کی مراد نفسِ انسانی ہے جس سے سلسلہ ارتقاء کی یہ کڑی (انسان) اپنی سابقہ کڑیوں (حیوانی زندگی) سے الگ اور متمیز ہوجاتی ہے۔اس توانائی کی نسبت جب خدا کی طرف ہوتی ہے،اس توانائی کا نام قرآن میں روح ہے اور جب اس توانائی کی نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے تو قرآن اس کو نفس کہتا ہے۔قرآن روح خداوندی کا قائل ہے لیکن روح انسانی کا قائل نہیں ہے۔نفس انسانی کا نشوونما کرنا انسان کا فریضہ زندگی ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (91:9-10) ترجمہ:اور نفس (انسانی) جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا،پھر سمجھ دی اس کو فجور و تقویٰ کی۔جس نے اس نفس کو سنوار لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو خاک میں ملایا وہ ناکام ہوا۔انسان کے ہر کام کا اثر اس کی ذات پر ہوتا ہے۔جن کاموں سے اس ذات کو استحکام ملتا ہے وہ کام اعمال حسنہ ہیں اور جن کاموں سے اس نفس کو ضعف و اضمحلال ملتا ہے وہ اعمال سیئہ ہیں۔

چونکہ نفس انسانی کی نشوونما انسان کی زندگی کا مقصد ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے وہ مستقل اقدار قرآنِ کریم میں تفصیل سے بیان فرمائی ہیں جن سے نفس انسانی کی پرورش ہوتی ہے۔ہم ان اقدار میں سے چند اقدار تحریر کریں گے اور پھر آپ خود اندازہ فرمالیں کہ کیا عقل انسانی یہ اقدار خود دریافت کرسکتی ہے۔ان اقدار پر صرف اجتماعی طور پر عمل ہوسکتا ہے اس لئے اسلامی نظام کا قائم کرنا ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔سیکولر حکومتوں کا قیام مقصود بالذات ہوتا ہے ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک Welfare حکومت ہو اور اس میں انسان کو تمام طبعی ضروریات آسانی سے مہیا اور فراہم ہوں۔اسلامی نظام کے قیام کا مقصد صرف طبعی ضروریات کی فراہمی نہیں ہوتا۔اسلامی نظام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں زندگی بسر کرنے سے نفس انسانی کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہوجائے اس کا زیادہ سے زیادہ تزکیہ ہو یعنی اس کی ساری صلاحیتیں بیدار ہوجائیں۔یہ تزکیہ نفس یعنی نفس انسانی کی پرورش صرف انسانی مملکت میں ہوسکتی ہے اور صرف اس مملکت میں زندگی بسر کرنے سے انسان کو وہ استحکام ذات حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ حیاتِ جاوید حاصل کرلیتا ہے لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ (44:56) ترجمہ:اس میں وہ سوائے پہلی موت کے جو جسم پر وارد ہوتی ہے موت سے دوبارہ دوچار نہیں ہوں گے۔اب آپ چند مستقل اقدار ملاحظہ فرمائیں الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ (92:18) جو شخص اپنا کمایا ہوا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے۔اس کا تزکیہ نفس ہوجاتا ہے۔

2۔تکریم انسانیت،ہر انسان ذات (Personality) کا حامل ہوتا ہے۔اس لئے ہر انسانی بچہ بلاتمیز رنگ و نسبت،

نسل، خون، خاندان، محض انسان ہونے کی وجہ سے یکساں واجب التکریم ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70)، ترجمہ: ہم نے بنی آدم کو عزت واحترام دیا۔ احترام انسانیت ایک مستقل قدر ہے۔ وقت اور مقام کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ برتر از گردوں مقام آدم است۔

3۔ مدارج کا تعین ہر فرد کے جوہرِ ذاتی کی بناء پر ہوتا ہے (46:19) جو شخص سب سے زیادہ اسلامی نظام کی اطاعت کرتا ہے وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوگا۔ (49:13)

4۔ مکافاتِ عمل، قرآنی تصورِ حیات کی ساری عمارت قانونِ مکافاتِ عمل پر استوار ہوتی ہے۔ یعنی انسان کے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے۔ اچھے اعمال کا اچھا نتیجہ۔ بُرے اعمال کا بُرا نتیجہ سامنے آ کر رہتا ہے۔

5۔ عدل واحسان، عدل کے معنی ہیں ہر شخص کو اس کا پورا پورا حق دینا اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر کے اس کے توازن کو برقرار رکھنا (16:90)

6۔ وحدت انسانیت، دین کا مقصد نوعِ انسانی کی عالمگیر برادری تشکیل کرنا ہے (10:14،2:213)، یہ برادری آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ (62:9)

7۔ ربوبیت عالمین، خدا رب العالمین ہے۔ ہر انسان کو دوسرے انسانوں کی ربوبیت کرنا ضروری ہے۔

8۔ نوع انسانی کی منفعت، وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) جو چیز پوری انسانیت کے لیے نفع بخش ہے وہ باقی رہتی ہے۔ جو ساری انسانیت کے لیے نفع بخش نہیں اس کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔

9۔ کوئی کسی کا محکوم نہیں (3:79) ہر فرد کی آزادی اور اس کا احترام مستقل قدر ہے۔

10۔ مشاورتی نظامِ حکومت، اقتدار پوری اُمت کو ملتا ہے۔ اُمت اور حکومت الگ الگ دو چیزیں نہیں ہوتیں اور کام سب کے مشورہ سے ہوتے ہیں۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)

مضمون طویل ہو گیا ہے۔ مضمون کو مزید طویل نہ کرنے کی وجہ سے ہم ان دس اقدار پر اکتفاء کرتے ہیں۔ آپ یہ غور فرمائیں کہ:

1۔ ان میں سے کوئی ایک قدر بھی ذہن انسانی بنا سکتا ہے؟

2۔ ان اقدار پر استوار شدہ معاشرہ بہترین معاشرہ ہوتا ہے۔

3۔ کیا کوئی وقت ایسا آ سکتا ہے کہ یہ اقدار فائدہ مند ہونے کی بجائے نقصان دہ ہو جائیں؟

اگر آپ ان امور پر غور فرمائیں گے تو قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت آپ کو مل جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کے خلاف شکوک و وساوس جب پیدا ہوتے ہیں جب قرآن کو بطور مذہب کے لیا جاتا ہے۔ جس دن مسلمانوں نے قرآن کریم بطور نظام کو جاری کر دیا اور اس کے نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے اسی دن سے یہ شکوک وشبہات خود بخود درفع ہو جائیں گے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہونے لگیں گے۔

محمد سلیم اختر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حسنِ ظن

(یہ عبارت 25 اکتوبر 2009ء بروز اتوار ٹرسٹ بلڈنگ' 25 بی' گلبرگ 2 'لاہور میں ایک مختصر سے حلقۂ سامعین میں پڑھی گئی تھی۔ اس کا مقصد قرآن میں بیان فرمودہ اخلاقِ جمیلہ کی روشنی میں اپنی اِصلاح کا موقعہ حاصل کرنا تھا۔ آخر میں سامعین نے سوالات بھی کئے اور تبصرے بھی۔ اس تحریر کو استفادۂ عام کے لئے شائع کیا جارہا ہے۔)

قرآنِ کریم میں ظن کا لفظ حق کے مقابلہ میں آیا ہے۔ حق پختہ یقین اور ٹھوس حقیقت کو کہتے ہیں جس میں کسی قسم کا شک کرنا ممکن نہ ہو۔ ظن صاف صاف اور واضح یقین نہیں ہوتا۔ صاف یقین علم ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ اور سورہ النساء میں ظن بمقابلہ علم آیا ہے جبکہ سورہ یونس میں ظن بمقابلہ حق آیا ہے۔ إِنَّ الظَّنَّ لاَ يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئاً (10:36)- ظن حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔

قرآنِ کریم کے پیشِ نظر جس قسم کا عالمگیر انقلاب ہے اسے جماعتِ مومنین کے ذریعہ روبہ عمل لایا جائے گا۔ جماعتِ مومنین کے اندر جس قسم کی صفات اور قواعد وضوابط کی ضرورت ہے اس سے متعلق ہدایات یوں تو پورے قرآنِ کریم میں جابہ جا دی گئی ہیں مگر سورہ الحجرات اس سلسلہ میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔

قرآنِ کریم کے پیشِ نظر جس قسم کا عالمگیر انقلاب ہے اسے جماعتِ مومنین کے ذریعہ روبہ عمل لایا جائے گا۔ جماعتِ مومنین کے اندر جس قسم کی صفات اور قواعد وضوابط کی ضرورت ہے اس سے متعلق ہدایات یوں تو پورے قرآنِ کریم میں جابہ جا دی گئی ہیں مگر سورہ الحجرات اس سلسلہ میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔

اس سورہ میں جہاں اپنی رائے کو مرکز کے فیصلے کے تابع رکھنے کو کہا گیا ہے اور آپس میں لڑائی جھگڑے کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے وہیں بدگمانی سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے ظن کو اثم تک کہہ دیا گیا ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ (49:12) اے ایمان والو ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ حسن ظن سے کام لو اور بدگمانی سے اجتناب کرو۔ بعض بدگمانی تو ایسی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کے متعلق خیر سگالی کے تمام جذبات کو مضمحل کر دیتی ہے حالانکہ وہ محض بدگمانی ہوتی ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔

اثم کے بنیادی معنوں میں اضمحلال، افسردگی، کمزوری، سست روی اور شکستگی کا پہلو ہوتا ہے۔ قرآن میں جرم کے لئے عدوان کے علاوہ اثم کا لفظ بھی آیا ہے۔ اثم میں وہ تمام اعمال شامل ہیں جن سے انسانی ذات میں افسردگی اور پژمردگی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے سفرِ حیات سست گام ہو جائے۔ قرآنِ کریم نے اثم کے کاموں میں دوسروں سے تعاون کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (5:2) بدگمانی چونکہ ایک اثم ہے اس لئے بدگمانی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے سورہ نور میں واضح ہدایت فرما دی ہے۔ لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا (24:12)- یعنی قرآن نے یہ اصول دیا ہے کہ جب بھی کسی سے متعلق کسی کے خلاف کوئی بات تم سے کہی جائے تو تمہارا First Reaction یہ ہونا چاہئے کہ جب تم اس بات کو سنو تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ساطرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے حسنِ ظن سے کام لو۔ وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ (24:12)- تمہیں کہنا یہ چاہئے کہ یہ بات تو بڑی جھوٹی سی نظر آتی ہے۔ یہ واقعہ گھڑا ہوا، بنایا ہوا سا لگتا ہے۔

ہمارے ہاں ملزم بری تو ہو جاتا ہے لیکن باعزت بری نہیں ہوتا۔ ملزم کی ابھی پہلی پیشی بھی نہیں ہوتی کہ گھر گھر اس کو مجرم تصور کر لیا جاتا ہے۔ سارے معاشرے میں شام تک اس کی اس قدر گھناؤنی پکچر پیش کر دی جاتی ہے کہ ہر شخص اسے مجرم سمجھنے لگ جاتا ہے۔

سوچئے اگر معاشرے کے اندر اتنی سی چیز پیدا ہو جائے وہ کس قدر تباہیوں سے بچ جائے۔ کسی تنظیم کے ارکان کے اندر یہ اخلاق پیدا ہو جائیں تو وہ کس قدر ترقی کرے۔ ایک بے گناہ ملزم، جس کا جرم ثابت نہیں، کے متعلق اپنے دل میں ہی اس قسم کے خیالات انسان کی اپنی ذات کو کس قدر مسخ کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں الزام (Elegation) اور جرم (Crime) میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ فلہٰذا ملزم اور مجرم میں بھی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ملزم وہ ہوتا ہے جس کے سر الزام ہوتا ہے جرم ابھی ثابت نہیں ہوا ہوتا۔ اس کا پورا طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ عدالت میں تحقیق ہوگی، گواہ آئیں گے، شہادتیں آئیں گی، ملزم کو صفائی کا موقعہ ملے گا اس کے بعد ممکن ہے وہ مجرم ثابت ہو جائے مگر نوے فی صد سے زیادہ ملزم تو بری ہو جاتے ہیں۔ ان کے خلاف جرم ثابت ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ملزم بری تو ہو جاتا ہے لیکن باعزت بری نہیں ہوتا۔ ملزم کی ابھی پہلی پیشی بھی نہیں ہوتی کہ گھر گھر اس کو مجرم تصور کر لیا جاتا ہے۔ سارے معاشرے میں شام تک اس کی اس قدر گھناؤنی پکچر پیش کر دی جاتی ہے کہ ہر شخص اسے مجرم سمجھنے لگ جاتا ہے۔ بے چارہ عدالت سے چھوٹ کے بھی آ جائے تو بدگمانی پھیلانے والوں نے چونکہ بڑھا چڑھا کے پھیلائی ہوتی ہے اس لئے وہ یہی کہے چلے جاتے ہیں کہ جی کیا پتہ! رشوتیں چلتی ہیں، سفارش کا راج ہے کیا معلوم کیا ہوا۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے پہلا اصول ہی یہ دیا ہے کہ جب بھی کسی کے متعلق کوئی بات آئے تو پہلا تاثر یہ ہونا چاہئے کہ نہیں نہیں! وہ ایسے نظر

نہیں آتے! شریف آدمی ہیں! پہلا تاثر نیک ہونا چاہئے۔ قَالُوا هٰذَآ إِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ۔ تحقیق کئے بغیر کسی بات کو آگے بڑھا دینا بہت بڑا جرم ہے۔ اس سلسلے میں قرآن نے کہا ہے کہ ''بات تم تک پہنچی، تمہیں اس کا کوئی ذاتی علم نہ تھا پھر تم نے کوئی تحقیق بھی نہیں کی، کوئی تفتیش نہیں کی اور لے اُڑے۔ تم نے اس عمل کو بالکل معمولی بات سمجھا حالانکہ وَهُوَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمٌ (24:15)- قانونِ خداوندی کی رو سے یہ بات بڑی عظیم ہے، جسے معمولی بات سمجھ رہے ہو یہ بہت بڑا جرم ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ زعم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر چونکہ قرآن کا نُور ہے اس لئے ہم کسی کے متعلق بغیر کسی ثبوت کے کوئی بھی فیصلہ یا فتویٰ صادر کر سکتے ہیں۔ یہ رویہ نہایت خطرناک ہے کیونکہ وہ حضرات ایسا ازخود نہیں بلکہ بزعم باطل قرآن کی روشنی میں کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ قرآن نے اس سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے (24:12)- کسی سے متعلق کوئی الزام ہو تو اسے Proper Forum پر پیش کیا جائے۔ کوئی بھی فرد اپنے تئیں عدالت یا جج کا قائم مقام نہیں ہو سکتا چاہے اس کا سینہ کتنا ہی قرآن کے نور سے روشن کیوں نہ ہو۔ رِبّی، پروہت اور مشائخ یہی کچھ تو کرتے چلے آ رہے ہیں کہ اپنی گھڑی ہوئی باتوں کو خدا کا کہا ہوا کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مومن کو مومن سے متعلق ہمیشہ حسنِ ظن سے کام لینا چاہئے اور اگر کوئی الزام ہو تو اسے "Proper Forum" پر پیش کرنا چاہئے۔

> قرآن نے یہ اصول دیا ہے کہ جب بھی کسی سے متعلق کسی کے خلاف کوئی بات تم سے کہی جائے تو تمہارا First Reaction یہ ہونا چاہئے کہ جب تم اس بات کو سنو تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کا سا طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے حسنِ ظن سے کام لو۔ وَقَالُوا هٰذَآ إِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ (24:12)- تمہیں کہنا یہ چاہئے کہ یہ بات تو بڑی جھوٹی سی نظر آتی ہے۔ یہ واقعہ گھڑا ہوا، بنایا ہوا سا لگتا ہے

فیصل آباد کے احباب کے لئے ضروری اطلاع

اب طلوعِ اسلام کی تمام بکس اور ''طلوعِ اسلام'' میگزین
فیصل آباد میں ہماری دو بزموں کے
علاوہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھی مل سکتے ہیں۔

فون نمبر:
0322-6386991

حکیم عبدالمجید
ہاؤس نمبر P-1479 سٹریٹ نمبر 1 محلہ فتح آباد، فیصل آباد

The Human Self and Allah

Episode No. 5

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

Hence, we cannot make a true estimateof Allah's being the First and the Last. The most we can say is that 'when there was nothing, there was Allah - and if there had been nothing, there would be Allah'.

The Quran does not,in any case, demand anything more than this from us.

1.20 Permanent Values

Leaving aside such few attributes, the rest of the Divine attributes are those which in modern terminology are called ethical attributes. For example, *Rabubiyat, Razzaqiyat, Rehmaniyat* etc.[1] These are those attributes which are called the Permanent Values. In the Quranic system of life these values have great significance, in fact we can say that the whole structure of this system (*Ad-Deen*) is raised on these foundations.

From this the question arises, why does man need these Permanent Values. He should solve his problems through the use of his intellect and reasoning. There is no doubt in this that man has been endowed with the ability of intellect and reasoning, and this is that trait which differentiates him from other animals. This is why the Quran places great emphasis on the use of intellect and reasoning, and knowledge and vision. According to the Quran, those people who do not make use of intellect and reasoning are:

> For the worst of beasts in the sight of Allah are the deaf and the dumb – those who understand not (do not use intellect). (8:22)

And

> Many are the Jinns (nomadic inhabitants) and men, We have made for hell: they have hearts wherewith they understand not, eyes wherewith they see not, and ears wherewith they hear not. They are like cattle – no, more misguided: for they are heedless (of warning). (7:179)

Through the use of knowledge and intellect, by studying the things of the universe, man harnesses the undiscovered forces of nature, and in this way

[1] *Rabubiyat*– means sustenance, *Razzaqyiat*– means nourishment, *Rehmaniyat* – means development. These are discussed in detail later in the book. (Ed)

becomes eligible for the 'prostration' of the angels (universal forces)before him.

1.21 Battle of Wits

But whereas in the outer universe human intellect becomes so useful in reaping beneficial results, when this same intellect is applied to the human world, then here it plays a strange game; or we can say that so long as the issue remains confined to controlling the forces of nature, human intellect continues to work without conflict and resistance. But as soon as the question of the use of these forces arises, this very same intellect becomes the cause for mutual clash and upheaval among men. For example, in the research for nuclear power, scientists all over the world are busy working in great peace and calmness in their respective laboratories. But once the nuclear bomb is ready, then conflicts erupt among the nations of the world over its use, and these clashes ultimately take on the shape of war, in which these same forces of nature which were to become the cause for the development of humanity, become instead the cause for the destruction of mankind. Why does this happen? This is because the demand of the intellect of every individual, every group and every nation is that it should protect itself, its own tribe and its own nation. It has no interest in the protection of the interests of any other individual, group or nation i.e. human intellect only sees its own interest - it has no concern about the welfare of others. Hence, when there is a clash of interests between different individuals or nations, then a battle of wits commences in their intellects. In other words, it can be understood that the sentiments of benefitting oneself and avoiding harm to oneself are included within the animal instincts of man.

The task of the intellect is to fulfil the demands of the human emotions. For example, there is a beautiful painting in the keeping of an individual and we desire to obtain it (this is the demand of our emotions). However, that individual does not wish to part with this painting (from this point conflict arises in our emotions). Now our intellect moves forward and in forms us of various trickeries on how to acquire this painting. Contrary to this, the intellect of the opponent tells him what steps should be taken for the protection of this painting (this can be called the battle of wits). Now it is obvious that the one whose intellect is sharper will be the one who is successful. After this, the opposing party will be on the lookout for an opportunity to take revenge on him – this is, in fact, what is called disorder. This means that the intellect of man follows on behind his emotions, just like the paws of a dog follow its nose (the smell of its prey). ❶

---

❶ At this stage these pointers are considered enough. Further details of these issues are available in my other books *Iblees O Adam*, *Insan Nay Kia Socha* and *What is Islam*?.

1.22 DecisionsThrough Laws

For the eradication or solution of these conflicts, a human society devises certain principles which are implemented equally on all the people who live within this society. These principles are called laws. This means that the various citizens of this society accept this fact that in the case of conflicting matters, instead of following their own desires and their own intellects, they will make decisions according to these accepted principles. The individual who does not decide according to these principles is forced by the society to abide by them. It is obvious that these principles (laws) have great significance in the social life of man. The demand of this requirement is:

(1) In the formulation of these principles there should be no intrusion of the emotions of any particular individual, any particular party, or any particular nation.

(2) And these principles should not be such that whenever it is wished these can be changed.

1.23 Immutable Laws

The Quran states that the formulation of these kinds of principles is not within the capacity of human intellect. This is because (in human matters)the intellect can never be free from emotions. Therefore, these principles should be obtained from such a place which is high above human emotions, and for Whom all human beings (not just men of one nation or one era but all of mankind) are equal. Obviously, such a status cannot be of anyone other than that of the Self of Allah. Permanent Values are those immutable and unchangeable principles which have been received from Allah for the guidance of the whole of mankind so that they can make their decisions in accordance to them. For the practical application of these principles, human society will work out bye-laws and sub-clauses according to the requirements of its own era, but there will be no authority to make any changes or modifications, or any deletions or additions in these principles. As has already been written, these immutable principles or Permanent Values are those Divine attributes which are termed as (with a view to comprehension) 'ethical principles.

1.24 Understanding the Quranic Principles

We have stated above that the formulation of these immutable principles (Permanent Values) is not within the capability of the human intellect. This does not mean that in order to understand these principles, and after understanding them to reach this conclusion that these are indeed true in their claims and do fulfil their aim, is also out with the scope of the intellect - not at all. The intellect

can understand them but there is an essential condition for this, which is that just as a scientist carries out observation and study of the outer universe using his intellect and vision in an objective manner, and does not allow his emotions and biases to influence them, if in the same way attention and analysis is applied to the Quranic principles, then their truth emerges and becomes evident. The Quran itself has informed us of the technique by which to verify the truth of its claims. In Surah *Yunus* it is stated:

> No, they charge with falsehood that whose knowledge they cannot compass, even before the elucidation thereof has reached them: thus did those before them make charges of falsehood: But see what was the end of those who did wrong! (10:39)

The first thing which is stated here is that denial of the Quranic proclamations is done by those people who do not comprehend its factual realities based on knowledge (27:84) i.e. it is essential that in order to understand the Quranic facts the level of know ledgeup to which human knowledge has reached within a particular era should remain in front of man. 'Up to the level of knowledge of this era' is said because, as the level of human knowledge continues to rise, the Quranic truths keep on becoming uncovered to the same extent.

The second thing it has said is that it is essential that the thinker who is pondering on the Quranic facts should study world history and become aware of the circumstances and conditions of previous nations. He will see what the outcome was of the nation which lived its life according to the principles of the Quran, and what were the consequences for the one that went against them. It is for this purpose that the Quran has repeatedly placed great weight on the study of history.

And the third technique is this, that a society should be allowed to be shaped according to the Quranic principles. The outcomes of this society will themselves reveal whether or not these principles are based on truth and fact. This is called the pragmatic test.

When thinking and reasoning about the facts of the Quran is performed in this way, then its truths will become uncovered one by one. But (as already noted) the condition is that this thinking and reasoning should not be allowed to become contaminated by emotions. As long as human emotions are not kept within the guidance of *Wahi*, the truth can never reveal itself before us. The Quran states:

...And who is more astray than one who follows his own lusts, devoid of guidance from Allah? For Allah guides not people given to wrongdoing. (28:50)

1.25 Problem of Good and Evil

In any event, this reality has also become evident to us that those Permanent Values or immutable principles according to which a human society should be shaped are indeed based on the Divine attributes. From this the significance of having the Divine attributes in front of us in an accurate manner can also be estimated.

We have already stated that through the correct concept of the Divine attributes and by their being balanced attributes (*Asma-al-Husna*) as per the explanation of the Quran, this most complicated problem of good and evil becomes automatically resolved. Briefly, it can be understood as follows: that the deed which is the cause for development, strength and integration of the human self is a good deed (and it is obvious that these can only be those deeds which are in accordance with the Permanent Values or the Divine attributes), and the deed which produces weakness and disintegration in the human self is evil (and it is obvious that these can only be those deeds which are contrary to the Permanent Values).This is the only criterion in the world for good and evil. From this it can also be judged what the relationship is between the Divine attributes and the human self, and what their importance is.

1.26 Comprehensiveness of Divine Attributes

From the above explanations this reality becomes evident that there is no corner of the outer universe and no area of the human world which is such that it is not connected to the Divine attributes. Whether it is the life of an individual in the human world, or the collective life of mankind, the correct shaping and accomplishment of all is on the pattern of the Divine attributes. These same attributes become the higher standard for the development of the self of an individual. And it is from these very attributes that those immutable principles are shaped, and it is by acting according to them that human society becomes a model of paradise. It is to these that the present successes as well as the future ascension of a human being are linked. By remaining dissociated from these, life can never reach the human level and instead remains stagnant at the animal level (indeed, sunk even lower than this).

It is evident from this what the importance is of the correct concept and knowledge of the Divine attributes in human life. This is the reason that the Quran has placed so much emphasis on *Eimaan* in Allah. (The very meaning of *Eimaan* in Allah is to have concrete conviction in the Divine attributes). This is that very basis on which the whole edifice of human life is raised – this is that very seed from which the 'virtuous' tree of righteous deeds bears fruit. In the words of Iqbal:

Life is built by deeds, Paradise as well as Hell.

There fore, *Eimaan* in Allah is essentially that focal point around which the whole universe of man revolves, and this is the reason that the Quran has explained the Divine attributes with such detailed clarification and exposition. Since this is not available anywhere in the worlds of religions and philosophies, therefore the teaching of the Quran is without parallel or example. And because a complete concept of these attributes is given with in it, there remains no need therefore for any other book (this also means any *Nabi*or Rasul)after this.

In the following pages, the Quranic explanations of these Divine attributes will appear before you.

2. *Ilaah*(god)

2.1 Linguistic Meaning

According to the dictionary, *Ali'ha, Ilay'hi, Ya'lahu* means to seek refuge from someone after becoming fearful, or to become awestruck; and *A'laha, Ya'lohu* means to give protection to someone, or to take them into peace and security. In relation to these meanings, *Ila'hun* will mean such a being from whom protection can be sought when in danger, to whom supplication can be made for the removal of difficulties, and from the perception of whose greatness and immensity man becomes awestruck. Some consider that this word is derived from *La'ha, Ya'lehu,* which means to hold high status and to be hidden from sight.

Some say that *A'laha* means that that person has become a slave, and *Alla'hahu* means that he has made him his slave. From this view point, *Ila'hun* will mean such a being whose supremacy and sovereignty should be accepted, whose law should be obeyed, and whose rule should be adhered to.

Note how the traits noted above can be found in some form or another among the various concepts which the human mind has established about 'god'. Their being supreme and great, hidden from sight, becoming awestruck by its perception, turning to it for help in times of anxiety caused by troubles, prostrating before it with lowliness and humbleness and obeying its orders - in other words, *Ila'hun* is that comprehensive term which encompasses every kind of concept of 'God'.

The Quran has used the word Allah for the Divine Self(details will be given in the next chapter) i.e. Allah is the name of the Self of God, the description of Whose attributes is spread throughout the pages of the Quran like sparkling pearls. For example, we say that Allah is *Raheem*, Allah is *Kareem* – so *Raheemi* and *Kareemi* are attributes of Allah. The view of most about this word (Allah) is that it is in fact a combination of *Al-Ila'hun*. Through frequent usage the word has gradually evolved to become Allah from *Al-Ila'hun*. In the Arabic language, by prefixing *Al*, a common noun becomes a proper noun. From this perspective the meaning of Allah will be that particular *Ilaah* Whose concept the Quran has put forward.

The focal point of Quranic teaching is *La-Ilaha-i-Lallah* i.e. there is no such being, no such power in the universe which can be acknowledged as *Ilaah* – such a being is only the One Who is called Allah by the Quran. In other words, this then means that it is only the law of Allah which is such Whose obedience should be adhered to in the universe; from Whom means of protection should be sought; Who should be made a shield for all troubles and difficulties. This law of His is so great and high, and master of so much power and supremacy, that man becomes lost in awe at the thought of His greatness and omnipotence. Looking at it from this angle, *Ilaah* brings forward the concept of Allah as a Being, and from another angle it is also His attribute. It is for this reason that we have commenced our illumination from the term *Ilaah*, so that after this the name of His Being (Allah) comes before us, and then the attributes of this Self, one by one, keep on becoming a source for the shining light of the heart and vision.

We have stated above that the fundamental point of Quranic teaching is *La-Ilaha-i-Lallah*. This proclamation has two parts. One ideological i.e. assurance of this matter and acceptance of this fact that there is no such power in the world before which one should prostrate, which should be obeyed, which should be accepted as master, and which should be considered as the focus of attention to meet one's needs – this is a negative aspect. This is a passive part of this teaching i.e. whatever

is in the mind about 'subjugation' should be forgotten, and when in this way the land is cleared, then a new structure should be erected over it. This is a positive aspect i.e. after rejecting all powers, acceptance of this fact that there is one and only one such power whose obedience is essential and prostrating in front of which is appropriate i.e. Allah. Removing all powers from the path in this way and creating a direct connection of man with Allah is the fundamental teaching of the Quran. And since the principal teaching of the Quran is not a new teaching but is the same message which is coming from Allah right from the beginning, therefore every messenger would renew this very same message.

2.2 Teaching of Different *Anbiya*

For example, the Quran states about Noah:

We sent Noah to his people: He said: 'O my people! Obey Allah, you have no other Ilaah (god) but Him…' (23:23) See also (7:59)

Regarding a messenger who came after Noah:

And We sent to them a messenger from among themselves (saying): 'Obey Allah! you have no other Ilaah but Him. Will you not fear Him (the consequences of not following Him)?' (23:32)

Regarding the messenger Hud:

…He said: 'O my people! Obey Allah, you have no other Ilaah but Him…'(7:65)

About the messenger Saleh:

…He said: 'O my people! Obey Allah, you have no other Ilaah (god) but Him…'(7:73) also see (11:61)

And the messenger Shoaib:

…He said: 'O my people! Obey Allah, you have no other Ilaah but Him…' (7:85) See also (11:84)

About the messenger Ilyas:

To Be Continued

8-مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

9-مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔

دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

10-مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

11- مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے، جنھیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔

12-مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

13-مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔

دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔

14-مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جاسکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوعِ انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

15-مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔

دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.75
ISSUE
4

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

یہ وہ لوگ ہیں جو اُن تمام صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے رسول!) تجھ پر بذریعۂ وحی نازل کی گئی ہیں، اور جو تجھ سے پہلے پیغمبروں کو اُن کے اپنے اپنے وقت میں دی گئی تھیں (اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔۔۔ اِن صداقتوں پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صحیح تاریخی شہادتوں سے اِس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اِس پروگرام پر اِس سے پہلے بھی کئی بار عمل ہو چکا ہے اور اس سے ہر بار وہی نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کا اب وعدہ کیا جاتا ہے، اس لیے اب بھی وہی نتائج مرتب ہوں گے ۔۔۔ وہ اِس طرح اِس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اِس ضابطۂ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جدوجہد سے اِنسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے ۔۔۔ وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔

(مفہوم القرآن سورۃ البقرہ:4)